شذرات		
جہاد و قتال	جاوید احمد غامدی	۲
قرآنیات		
المائدہ (۱۵)	جاوید احمد غامدی	۵
معارف نبوی		
ماتم اور نسب میں طعنے کا انجام	طالب محسن	۱۱
سیر و سوانح		
حضرت عثمان غنی (۵)	وسیم اختر مفتی	۱۵
نقطۂ نظر		
قرآن مجید کے بنیادی علوم	مولانا الطاف احمد اعظمی	۲۳
مختارات		
مغربی ذہین کی فکری تشکیل	نعیم احمد بلوچ	۴۱
اصلاح و دعوت		
نکاح کیا نہیں ہے؟	ریحان احمد یوسفی	۵۱
وفی		
ات		
میاں طفیل محمد کی یاد میں	خورشید احمد ندیم	۵۵
یسئلون		
متفرق سوالات	محمد بلال	۶۱

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

جہاد و قتال

جہاد کے معنی کسی جدوجہد میں پوری قوت صرف کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ تعبیر جس طرح اللہ کی راہ میں عام جدوجہد کے لیے آئی ہے، اِسی طرح قتال فی سبیل اللہ یا اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے بھی آئی ہے۔ اِس کی دو صورتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں:

ایک کفر کے خلاف جنگ،

دوسرے ظلم و عدوان کے خلاف جنگ۔

پہلی صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اِس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہ راست حکم سے اور اُنھی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے۔ اِس قانون کے تحت آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کفر کے خلاف جو جنگیں لڑی ہیں، وہ محض جنگیں نہ تھیں، بلکہ خدا کا عذاب تھا جو سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اِس کے بعد جزیرہ نماے عرب سے باہر کی بعض قوموں پر نازل کیا گیا۔ آپ پر نبوت ختم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ لوگوں کی تکفیر اور اُن کے خلاف محض اُن کے کفر کی وجہ سے جنگ اور اِس کے نتیجے میں مفتوحین کو قتل کرنے یا اُن پر جزیہ عائد کر کے اُنھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق بھی آپ اور آپ کے صحابہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اِس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسری صورت، البتہ شریعت کا حکم ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے جہاد و قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اسلامی شریعت میں جہاد اِسی مقصد سے کیا جاتا ہے۔ یہ نہ خواہش نفس کے لیے ہے، نہ مال و دولت کے لیے، نہ ملک کی تسخیر اور زمین کی حکومت کے لیے، نہ شہرت و ناموری کے لیے اور نہ حمیت و حمایت اور عصبیت یا عداوت کے کسی جذبے کی تسکین کے لیے۔ انسان کی خود غرضی اور نفسانیت کا اِس جہاد و قتال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی جنگ ہے جو اُس کے بندے، اُس کے حکم پر اور اُس کی ہدایت کے مطابق اُس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اُن کی حیثیت اِس جنگ میں محض آلات و جوارح کی ہے۔ اِس میں اُنھیں اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی اِس حیثیت سے سر مو کوئی انحراف نہیں کر سکتے۔

اِس کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے، اُس کی اہم دفعات یہ ہیں:

۱۔ جہاد و قتال کا حکم مسلمانوں کو بحیثیت جماعت دیا گیا ہے۔ اِس کی جو آیتیں بھی قرآن میں آئی ہیں، مسلمان اپنی انفرادی حیثیت میں اُن کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ حدود و تعزیرات کی طرح اِن آیات کے مخاطب وہ بحیثیت جماعت ہیں۔ لہٰذا اِس معاملے میں کسی اقدام کا حق بھی اُن کے نظم اجتماعی کو حاصل ہے۔ اُن کے اندر کا کوئی فرد یا گروہ ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اُن کی طرف سے اِس طرح کے کسی اقدام کا فیصلہ کرے۔

۲۔ قرآن میں اِس کا حکم اصلاً فتنہ کے استیصال کے لیے آیا ہے۔ اِس کے معنی کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'persecution' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جان و مال اور عقل و رائے کے خلاف زیادتی کی دوسری تمام صورتیں اِسی کے تحت ہیں۔ چنانچہ ظلم و عدوان جس صورت میں بھی ہو، یہ اُس کے خلاف کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ جہاد مسلمانوں پر اُس وقت تک فرض نہیں ہوتا، جب تک دشمن کے مقابلے میں اُن کی حربی قوت ایک خاص حد تک نہ پہنچ جائے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جہاد و قتال کی اِس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے وہ نہ صرف یہ کہ اپنے اخلاقی وجود کو محکم رکھنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی حربی قوت بھی اُس درجے تک لازماً بڑھائیں جس کا حکم قرآن نے زمانۂ رسالت کے مسلمانوں کو اُس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے دیا تھا اور اُن کے اور اُن کے دشمنوں کے درمیان اِس کے لیے ایک اور دو کی نسبت قائم کر دی تھی۔

۴۔ جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا صرف اُس صورت میں جرم ہے، جب کوئی مسلمان نفیر عام کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اُس وقت یہ بے شک، نفاق جیسا بڑا جرم بن جاتا ہے۔ یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ہے جس کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حصول کا جذبہ ہر شخص میں ہونا چاہیے۔ لیکن اِس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے، یہ اُن فرائض میں سے نہیں ہے جنھیں پورا نہ کیا جائے تو آدمی مجرم قرار پائے۔

۵۔ جہاد اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے اِن سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔ اِس حکم کے ذیل میں جو سب سے اہم ہدایت قرآن میں بیان ہوئی ہے، وہ عہد کی پابندی کی ہے۔ غدر اور نقض عہد کو اللہ تعالیٰ نے بدترین گناہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ اِسی طرح جو لوگ جنگ کے لیے نہ نکلیں یا جنگ کے موقع پر کسی وجہ سے غیر جانب دار رہنا چاہتے ہوں، اُن کے خلاف بھی کسی اقدام کی اجازت نہیں ہے۔ یہ صرف مقاتلین (combatants) کے خلاف کیا جا سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

(۱۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَالْکُفَّارَ اَوْلِیَآءَ، وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا. ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ: یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ ھَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ

ایمان والو، تم سے پہلے جنھیں کتاب دی گئی، اُن میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا لیا ہے، اُنھیں اور دوسرے منکروں کو اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔[۱۴۳] (تم دیکھتے نہیں ہو کہ) جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اُس کا مذاق اڑاتے اور اُسے کھیل بنا لیتے ہیں۔[۱۴۴] اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔[۱۴۵] اِن سے کہو، اے اہل کتاب، کیا اِسی بات کا غصہ

۱۴۳؎ یہ دین کے لیے مسلمانوں کی حمیت کو ابھارا ہے کہ جو لوگ تمھارے دین کا مذاق اڑاتے اور تمھارے دینی شعائر کو کھیل تماشا بناتے ہیں، وہ تمھارے دوست کس طرح ہو سکتے ہیں؟ انسان کی فطرت تو یہ ہے کہ وہ اپنی کسی چیز کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ تم پر حیف ہے کہ اِسے برداشت کرتے ہو، بلکہ توہین کرنے والوں کو دوست بھی بناتے ہو۔

۱۴۴؎ یہ اُس چیز کا بیان ہے جسے وہ مذاق کا نشانہ بناتے تھے، یعنی اذان جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ قُلْ: هَلْ اُنَبِّئُكُمْ
بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ، مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ
وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ. اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾

ہم پر نکال رہے ہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اُس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور اُس پر بھی جو اِس سے پہلے اتاری گئی، اور اِس کا کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں[۱۴۶]۔ اِن سے کہو، میں تمھیں اُن لوگوں کا پتا دوں جن کا انجام خدا کے ہاں اُس سے بھی بُرا ہے (جو تم ہمارے لیے سوچتے ہو)[۱۴۷]؟ یہ وہ ہیں کہ جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اُس کا غضب ہوا، جن کے اندر سے اُس نے بندر اور سؤر بنائے[۱۴۸] اور جنھوں نے شیطان کی پرستش کی ہے۔ یہ درجے میں بدتر اور صحیح راستے سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں[۱۴۹]۔ ۵۷-۶۰

کی منادی کے لیے ایک سنت کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ یہود کے اشرار بھونڈے طریقے سے اِس کی نقلیں اتارتے اور اِس پر ہنستے ہنساتے تھے۔

۱۴۵؎ اِس لیے کہ کوئی معقول شخص یہ پسند نہیں کرسکتا کہ کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے بلائے اور وہ اُس کا مذاق اڑائے یا نیکی اور بھلائی کی کسی دعوت کے بارے میں ہنسی ٹھٹھے اور مسخرے پن کا رویہ اختیار کرے۔

۱۴۶؎ یعنی اِس بات کا غصہ کہ تم میں سے اکثر نافرمان ہیں اور نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا فرماں برداری کا رویہ اختیار کرے اور اِس کے نتیجے میں خدا کی خوشنودی حاصل کر لے۔

۱۴۷؎ یہ قرآن نے نہایت لطیف طریقے سے مذاق اڑانے والوں کے اپنے جرائم اُن کے سامنے رکھ دیے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے لیے بُرا انجام سوچ رہے ہیں، مگر اپنے کرتوتوں سے صرف نظر کیے ہوئے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بُرا انجام اُن لوگوں کا ہے جو اِس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، نہ کہ اُن لوگوں کا جو اللہ کے تمام رسولوں اور اُس کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے اور اُن کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۴۸؎ اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جس میں یہود کی ایک بستی کے لوگوں نے سبت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں پہلے اُن کی سیرت مسخ ہوئی، پھر اُن میں اور جانوروں میں ایک ظاہری فرق

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا: اٰمَنَّا، وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ، لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٢﴾ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ، لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾

یہ جب تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں، دراں حالیکہ کفر لیے ہوئے آتے اور اُسی کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں اور (نہیں سمجھتے کہ) اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں[150]۔ تم دیکھتے ہو کہ اِن میں سے اکثر حق تلفی، ظلم و زیادتی اور حرام خوری کے لیے سرگرم عمل ہیں[151]۔ کیا ہی بُرا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ اِن کے علما اور فقہا اِنھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ کیا ہی بُرا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں[152]۔ ۶۱-۶۳

جو تھوڑا سا رہ گیا تھا، وہ بھی مٹ گیا۔ یہاں تک کہ خدا کی لعنت نے اُن کے ظاہر و باطن ہر چیز کا احاطہ کر لیا۔

۱۴۹؎ یہ دوسری بات پہلی بات کے لیے دلیل ہے۔ یعنی راستے سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، اِس لیے آخرت میں اپنے انجام کے لحاظ سے بھی لازماً بدتر ٹھیریں گے۔

۱۵۰؎ یہ بھی یہود ہی کا ذکر ہے، لیکن یہ اُن کے وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے تھے، مگر اپنے دل میں یہی سمجھتے تھے کہ وہ اگر آپ کو مان رہے ہیں تو امیوں کے لیے اللہ کا رسول مان رہے ہیں۔ رہے وہ تو اُن کے لیے اُن کے اپنے نبی اور اپنے صحیفے ہی کافی ہیں۔ وہ اِس دائرے سے باہر کی کسی ہدایت کو ماننے کے مکلّف نہیں ہیں۔ قرآن نے صاف واضح کر دیا کہ یہ صریح کفر ہے۔ اِس طرح کا ایمان کسی درجے میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

۱۵۱؎ یہ قرآن نے اِن کے دعویٰ ایمان کی قلعی کھول دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایمان کے ساتھ کسی ظلم و زیادتی کا صادر ہو جانا یا کسی حرام سے آلودہ ہو جانا تو بعید نہیں ہے، لیکن حرام خوری ہی کسی کا اوڑھنا بچھونا بن جائے اور اُس کی ہر وقت کی تگ و دو ظلم و زیادتی ہی کی راہ میں ہو تو

وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ: یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ، غُلَّتْ اَیْدِیْھِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا، بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ، یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ، وَلَیَزِیْدَنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ طُغْیَانًا وَّکُفْرًا، وَاَلْقَیْنَا بَیْنَھُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ، کُلَّمَآ

یہودی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں[153] ــــ اِنھی کے ہاتھ بندھیں اور اِن کی اِس بات کی وجہ سے اِن پر لعنت ہو[154] ــــ (ہرگز نہیں)، بلکہ اُس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے۔[155] حقیقت یہ ہے کہ اِن میں سے بہتوں کی سرکشی اور اِن کے کفر کو وہ چیز بڑھا رہی ہے جو تم پر تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔[156] (اِن کا یہی رویہ ہے جس کے باعث) ہم نے قیامت تک کے لیے اِن کے درمیان دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے۔[157] یہ جب کبھی جنگ کی آگ

بہت ہی برا عمل ہے یہ جو ایمان کے دعوے کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اِس بات کو دوسرے مقام میں یوں بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر اِن کا ایمان اِنھی باتوں کا حکم دے رہا ہے تو بہت ہی بری باتوں کا حکم دے رہا ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۵۳)

۱۵۲ یعنی عام لوگ تو ایک طرف، اِن کے علما اور فقہا بھی ایمان و اخلاق کے لحاظ سے ایسے مردہ ہو چکے ہیں کہ اِن کو اِن جرائم سے نہیں روکتے۔ اِس کی وجہ اِس کے سوا کیا ہے کہ وہ خود بھی یہی کر رہے ہیں۔

۱۵۳ یعنی اِس بات کے لیے بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ہمارے سوا کسی اور پر اپنا کلام نازل کرے اور اُسے نبوت اور کتاب عطا فرمائے۔

۱۵۴ یہ جملۂ معترضہ کے طور پر فوراً اُن پر لعنت کی ہے، اِس لیے کہ یہود کی یہ بات صرف احمقانہ نہیں، اِس کے ساتھ آخری درجے کی گستاخی بھی ہے۔ ایمان کا دعویٰ رکھنے والا کوئی شخص اِس طرح کی بات اپنے پروردگار کے بارے میں کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

۱۵۵ یعنی اِن کا پابند نہیں ہے کہ فلاں کو نبوت دے اور فلاں کو نہ دے۔ وہ اپنے قانون اور اپنی حکمت کے مطابق جس پر چاہتا ہے، یہ عنایت فرماتا ہے۔

۱۵۶ اِس سے واضح ہے کہ 'یُنْفِقُ مَا یَشَآءُ' میں جس انفاق کا ذکر ہے، وہ یہی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ اِس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اللہ اِن کے علاوہ بھی کسی کو اپنی کتاب اور نبوت کے لیے خاص کر سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے یہ نعمت بنی اسمٰعیل کو دینے کا فیصلہ کیا ہے تو یہی چیز اِن کے کفر اور طغیان کو بڑھانے کا باعث بن گئی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ، وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ، مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيْرٌ

بھڑکاتے ہیں، اللہ اُسے بجھا دیتا ہے، (ورنہ یہ تو اِسی طرح بغاوت پھیلاتے) اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اللہ اِن فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔۶۴

(اِس کے برخلاف) اگر یہ اہل کتاب (ہمارے پیغمبر پر) ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو (اِس کے صلے میں) ہم اِن کی برائیاں اِن سے دور کر دیتے اور اِن کو نعمت کے باغوں میں پہنچاتے۔ اور اگر (اپنی اجتماعی حیثیت میں) تورات و انجیل پر اور اُس چیز پر قائم ہو جاتے جو اِن کے پروردگار کی طرف سے اِن پر اتاری گئی ہے[158] تو اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے رزق پاتے[159]۔ (اِس میں شبہ

۱۵۷؎ اِس سورہ کی آیت ۱۴ میں نصاریٰ سے متعلق بھی یہی فرمایا ہے۔ فرقہ بندی کا جنگ و جدال اِسی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ صورت حال حق کے مقابلے میں سرکشی کا قدرتی نتیجہ ہے اور اِس جرم کی سزا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی بنا پر اِس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

۱۵۸؎ یعنی قرآن مجید۔ اِس سے واضح ہے کہ اِن کتابوں میں اِس سے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ بعد میں آنے والی کتاب قانون سے متعلق بعض چیزوں میں ترمیم و اضافہ کر دیتی ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے دین ایمان و اخلاق کی دعوت ہے۔ تورات و انجیل اور قرآن میں اصلاً یہی دعوت بیان ہوئی ہے اور مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی نے اللہ کی سب کتابوں اور سب پیغمبروں کو ماننے اور اُن کی تعلیمات پر قائم ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اہل کتاب کو یہ دعوت اِسی لحاظ سے دی گئی ہے۔

۱۵۹؎ بنی اسرائیل سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اگر حق پر قائم ہوں تو اللہ تعالیٰ اِسی دنیا میں اپنی برکتوں کے دروازے اُن کے لیے کھول دے گا۔ یہ اِسی وعدے کا ذکر ہے۔ استثنا میں یہ وعدہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مِّنۡهُمۡ سَآءَ مَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿٦٦﴾

نہیں کہ) اِن میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو راستی پر قائم ہے، لیکن زیادہ وہی ہیں جن کے اعمال بہت بُرے ہیں۔ ۶۵-۶۶

''اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جاں فشانی سے مان کر اُس کے اِن سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں، احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا۔ اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو ملیں گی۔ شہر میں بھی تو مبارک ہو گا اور کھیت میں بھی مبارک ہو گا... خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں، تیرے روبرو شکست دلائے گا۔ وہ تیرے مقابلے کو تو ایک ہی راستے سے آئیں گے، پر سات سات راستوں سے ہو کر تیرے آگے سے بھاگیں گے... اور دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے، تجھ سے ڈر جائیں گی... اور خداوند تجھ کو دُم نہیں، بلکہ سر ٹھیرائے گا اور تو پست نہیں، بلکہ سرفراز ہی رہے گا... لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اُس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں، احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہو گا اور کھیت میں بھی لعنتی ہو گا... خداوند تجھ کو تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا۔ تو اُن کے مقابلے کے لیے تو ایک ہی راستے سے جائے گا اور اُن کے سامنے سے سات سات راستوں سے ہو کر بھاگے گا اور دنیا کی تمام سلطنتوں میں تو مارا مارا پھرے گا۔'' (۲۸: ۱-۲۵)

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

ماتم اور نسب میں طعنے کا انجام

عَـنُ أَبِـیُ هُـرَیُرَةَ (رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ) قَالَ: قَالَ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَسَـلَّـمَ: اثُـنَتَـانِ فِـی النَّاسِ، هُمَا بِهِم کُفُرٌ: الطَّعُنُ فِی النَّسَبِ، وَالنِّیَاحَةُ عَلَی الُمَیِّتِ.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کی دو عادتیں ہیں۔ یہ ان کے ساتھ کفر ہیں: نسب میں طعن اور میت پر نوحہ۔

لغوی مباحث

'هـما بهم کفر': اس جملے میں 'بهم'، 'فیهم' کے معنی میں ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ دو چیزیں جس میں ہوں، وہ ایمان کی حقیقت سے محروم ہے۔ اسی طرح 'اثنتان' کے بعد 'مـن اعمال کفر' یا 'من اخلاق جاهلیة' کے الفاظ محذوف ہیں۔

'الطعن فی النسب': 'طعن' کا لفظ اصلاً چبھونے اور گھونپنے کے معنی میں آتا ہے، لیکن زبان سے نکلنے والی تکلیف دہ باتیں بھی طعن ہی کہلاتی ہیں۔ نسب میں طعن سے مراد یہ ہے کہ نسب کے بارے میں کوئی ناگوار بات کہی جائے۔

'النیاحة': اردو کے لفظ بین کرنے کا مترادف ہے۔ عرب عورتیں بھی میت پر بین کرتی تھیں۔ مزید براں شدت اظہار کے لیے کپڑے پھاڑ لیتیں، گال پیٹتیں، سینہ کوبی کرتیں، سر میں خاک ڈالتیں اور اس طرح کی دوسری

حرکتیں بھی کرتی تھیں۔نوحہ کا لفظ ان سب کے لیے بولا جاتا ہے۔

معنی

کسی شخص کے حسب نسب کے بارے میں کوئی گفتگو کرنا ایک اخلاقی جرم ہے۔قرآن مجید میں یہ بات بڑے محکم انداز میں بیان ہوئی ہے کہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں۔قرآن مجید نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو تقویٰ میں سب سے آگے ہے۔سورۂ حجرات میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ خاندان، ذات،قبیلہ محض تعارف کا ذریعہ ہیں۔قرآن مجید کے یہ سارے بیانات انسانوں میں یہ احساس اور شعور پیدا کرنے کے لیے ہیں کہ وہ ذلت و پستی حسب نسب میں نہیں اخلاق و کردار میں ہے،لیکن انسانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ خاندان، قبیلہ اور قوم سے وابستگی کو معیار عظمت و ذلت بنا لیتے ہیں۔کاروبار اور پیشے کو اس کا سبب سمجھنے لگ جاتے ہیں۔دولت اور اقتدار سے بڑائی اور چھوٹائی طے کرنے لگ جاتے ہیں۔یہی چیز ہے جو انسانوں کی زبان پر حسب نسب کے بارے میں ناروا تبصرے لانے کا باعث بنتی ہے۔جو شخص مسلمان ہے اور خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہے،ان کے دیے ہوئے احکام اور بنائے ہوئے اخلاقی معیارات سے روگردانی کو جائز نہیں سمجھتا، بلکہ انھیں اپنے لیے ہدف جانتا اور ان پر عمل کے لیے کوشاں رہتا ہے۔اس سے گناہ اور غلطی تو ہو سکتی ہے،لیکن وہ نہ گناہ پر اصرار کر سکتا ہے، نہ اللہ کی مقرر کردہ حلت و حرمت میں تصرف کی جرأت دکھا سکتا ہے۔نہ اس کے گناہ میں سرکشی اور بے پروائی ہو سکتی ہے۔اگر کسی گناہ میں یہ عناصر شامل ہو جائیں تو گناہ کی شناعت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں بھی کچھ گناہوں کے حوالے سے ایمان کی نفی کی ہے۔ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ نفی ان جرائم کی شناعت بیان کرنے کے لیے ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر گناہ ایمان سے غفلت کے باعث ہوتا ہے،لیکن اگر اس میں مذکورہ عناصر شامل ہو جائیں تو سبب محض غفلت نہیں رہتا،اس میں ایمان سے انحراف کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔

نوحہ کرنا ممنوع ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بڑی وضاحت سے بیان کی ہے، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جب عورتوں سے بیعت لیتے تھے تو ان سے نوحہ نہ کرنے کی بیعت لیتے تھے۔آپ ان سے عہد لیتے کہ وہ گال نہیں پیٹیں گی، گریبان نہیں پھاڑیں گی اور جاہلیت کی صدائیں نہیں لگائیں گی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نوعیت کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کا حادثہ جب بھی پیش آئے تو دکھ کے اظہار کی ایسی صورتیں نہیں اختیار کرنی چاہییں جو ضبط و صبر کے منافی ہوں۔رہی یہ بات کہ یہ نوحہ ایمان کے منافی کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ خدااور آخرت پر ایمان کسی انسان کے اندر راضی برضا ہونے کی جو کیفیت پیدا کرتا ہے نوحہ و بین اس کی نفی ہے۔

یہی معاملہ نسب میں طعن کا ہے۔ کسی خاندان کو کم تر سمجھنا یا کسی کی کسی والدین سے نسبت پر سوال اٹھانا طعن کی کوئی بھی صورت ہو، یہ دین کے واضح احکام کی خلاف ورزی ہے۔ اس اعتبار سے یہ گناہ ہے۔ گناہ غفلت سے بھی ہوتے ہیں اور لاپروائی، سرکشی اور اصرار سے بھی۔ صورت خواہ کوئی بھی ہو دین سے تعلق میں کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔ غرض یہ کہ نافرمانی دین وایمان سے دوری کی حالت ہے۔

متون

اس روایت کے تین جملے ہیں: پہلا جملہ 'اثنتان فی الناس ھما بھم کفر' ہے۔ یہ جملہ دو اور صورتوں میں بھی آیا ہے۔ کچھ راویوں نے اسے 'شعبتان من امر الجاھلیة' کی صورت میں روایت کیا ہے اور کچھ نے اسے 'شعبتان لا تترکھا امتی' کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بعض مرویات میں دو کے بجائے تین چیزیں بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ ان روایات میں ابتدائی جملہ 'ثلاث من کفر باللّٰہ'، 'ثلاثة من کفر باللّٰہ' یا 'ثلاثة من الجاھلیة' کی صورت میں ہے۔

دوسرا جملہ 'الطعن فی النسب' کا ہے۔ بعض رواۃ اس میں 'نسب' کی جمع لائے ہیں اور اسے 'الطعن فی الأنساب' کے الفاظ میں روایت کرتے ہیں۔

تیسرا جملہ 'النیاحة علی المیت' ہے۔ کچھ راویوں نے 'علی المیت' کے الفاظ حذف کر دیے ہیں اور صرف 'النیاحة' روایت کیا ہے۔

جن مرویات میں تین چیزیں بیان ہوئی ہیں، ان میں تیسری چیز یا تو 'شق الجیب' (گریبان پھاڑنا) یا 'الفخر بالأحساب' (خاندان پر فخر) ہے۔

کتابیات

مسلم، رقم ۶۷؛ ابن حبان، رقم ۱۴۶۵؛ مستدرک، رقم ۱۴۱۵؛ سنن بیہقی، رقم ۶۹۰۳؛ مسند احمد بن حنبل، رقم ۱۰۴۳۸؛ المعجم الکبیر، رقم ۶۱۰۰؛ المنتقی لابن جارود، رقم ۵۱۵؛ الادب المفرد، رقم ۳۹۵۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

عثمان غنی رضی اللہ عنہ

(۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔'']

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت علیؓ اور محمدؓ بن مسلمہ نے مدینۃ النبی کا گھیرا کرنے والے باغیوں سے پوچھا، تم ایک بار جانے کے بعد دوبارہ کیوں آ گئے ہو؟ انھوں نے کہا، ہم اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے کہ ایک ہرکارہ دکھائی دیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ امیر المومنین کا غلام ہے اور ان کا خط لے کر گورنر مصر کے پاس جا رہا ہے۔ خط پر مہر خلافت ثبت تھی اور اس میں عبدالرحمان بن عدیس، عمرو بن حمق، عروہ بن حمق اور عروہ بن بیّاع کے قتل، سولی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کے احکام درج تھے۔ ان حضرات نے یہ بات سنی تو باغیوں کی حضرت عثمانؓ سے ملاقات کرانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ فریقین روبرو ہو کر اس مسئلے کو سلجھا سکیں۔ سیدنا عثمانؓ کو دیکھ کر خارجیوں نے سلام تک نہ کیا۔ انھوں نے ابن ابی سرح کے مظالم کی شکایت کی اور کہا، وہ مال غنیمت کو اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔ خط کے بارے میں حضرت عثمانؓ نے تسلیم کیا کہ اسے لے جانے والا غلام اور اونٹ انھی کے ہیں، مہر بھی ان کی ہے، لیکن واللہ! نہ خط انھوں نے لکھوایا نہ غلام کو بھیجا نہ اسے سواری دی، اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ عبدالرحمان بن عدیس نے کہا، آپ کی مہر لگا کر آپ ہی کے غلام اور سواری کو استعمال کر لیا گیا، اس قدر جسارت ہوئی اور آپ کو پتا تک نہ لگا؟ انھوں نے کہا، ہاں ایسا ہی ہے۔ ابن عدیس بولا، اس صورت میں دو باتوں کا امکان ہے، آپ سچ بتا رہے ہیں یا دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں۔ دوسری صورت مان لی جائے تو ہمارے ناحق قتل کا حکم دینے کی وجہ سے آپ مستحق عزل ہو چکے اور اگر یہ تسلیم کر

لیا جائے کہ آپ سچ بول رہے ہیں تو بھی آپ کو خلافت برقرار رکھنے کا حق نہیں، کیونکہ اپنی کمزوری اور غفلت کی بنا پر آپ اس کی ذمہ داریاں نبھانے کے اہل نہیں۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا، میں اس قمیص کو نہ اتاروں گا جو اللہ نے مجھے پہنائی ہے، میں توبہ واصلاح کروں گا۔ باغیوں کے لیڈر نے کہا، اگر یہ پہلا گناہ ہوتا تو ہم توبہ کو مان لیتے۔ آپ توبہ کرتے ہیں پھر اسی عمل کو دہراتے ہیں۔ ہم آپ کو معزول یا قتل کیے بغیر نہ ٹلیں گے۔ اگر آپ کے ساتھیوں نے روکا تو ہم جنگ کر کے آپ تک پہنچ جائیں گے۔ سیدنا عثمانؓ نے کہا، میں محض اپنے دفاع کے لیے کسی کو لڑائی کا حکم نہ دوں گا اور خلع خلافت اتارنے کے بجائے شہادت پانے کو ترجیح دوں گا۔

یہ خط دراصل مروان نے حضرت عثمانؓ کے علم میں لائے بغیر ان کے قلم سے اور ان کی مہر خلافت لگا کر از خود لکھا تھا، اس خیال کے حق میں محمدؓ بن مسلمہ کی تائید موجود ہے۔ مروان چاہتا تھا کہ اس اہم مسئلے میں سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۳۳ کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اللہ فرماتے ہیں،

"انما جزاؤ الذین یحاربون اللّٰہ و رسولہ و یسعون فی الارض فسادًا ان یقتّلوا او یصلّبوا او تُقطّع ایدیھم و ارجلھم من خلاف او یُنفوا من الارض۔"

''بے شک، ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں اور زمین میں فساد مچاتے پھریں، یہی ہے کہ بری طرح قتل کر دیے جائیں، سولی چڑھا دے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ درست ہے کہ وہ لوگ خلافت اسلامیہ کے باغی اور فساد فی الارض کے مرتکب تھے اور ایسے ہی لوگوں پر آیت محاربہ کے احکامات لاگو ہوتے ہیں تاہم مروان حاکم مجاز تھا نہ اسے حق تھا کہ قرآن کے احکام کو پورا کرنے کے لیے جعل سازی سے کام لیتا۔ ایک اور خط میں محمد بن ابوبکرؓ کے قتل کا حکم درج تھا۔ کئی جعلی خطوط باغیوں نے بھی لکھے، ان میں متعدد صحابہؓ کی طرف سے حضرت عثمانؓ سے قتال کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔

اسی شورش کے دوران میں ایک بار سیدنا عثمان مسجد نبوی میں آئے اور دریافت کیا، کیا یہاں علیؓ ہیں؟ انھیں بتایا گیا، وہ موجود ہیں تو پوچھا، کیا زبیرؓ ہیں؟ ان کی موجودگی کا علم ہونے کے بعد طلحہؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص کے ہونے کی اطلاع پائی تو فرمایا، میں تمھیں اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تمھیں معلوم ہے، جب مسجد نبوی نمازیوں کے لیے چھوٹی پڑ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو خاص اپنے مال سے فلاں قبیلے کا باڑا

خریدے گا تو اللہ اس کی مغفرت کرے گا اور اسے جنت میں اس سے بہتر گھر ملے گا۔ میں نے وہ احاطہ خرید لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے ہماری مسجد میں شامل کر دو، اس کا اجر پاؤ گے۔ اب تم مجھے اس مسجد میں دوگانہ ادا کرنے سے بھی روک رہے ہو؟ حضرت عثمانؓ نے مزید کہا، جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے، بیر رومہ کے سوا کوئی کنواں ایسا نہ تھا جس کا پانی میٹھا ہو۔ مسافر بھی بلا قیمت اس سے سیراب نہ ہو سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا: کون اس کنویں کو خالص اپنے مال سے خرید کر اس میں مسلمانوں کا حصہ اپنے حصے کے برابر ٹھہرائے گا؟ اسے جنت میں اس سے کہیں بہتر بدلہ ملے گا۔ میں نے اسے خاص اپنے مال سے خریدا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے اہل ایمان کے لیے وقف کر دو، تمھیں ثواب ملتا رہے گا۔ اب تم مجھے اس میں سے پانی پینے سے بھی روک رہے ہو؟ تمھیں اللہ کی قسم ہے، تم جانتے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے غزوۂ تبوک کے دن بڑے بڑے سرداروں کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''جو اس لشکر (جیش عسرت) کے لیے اسلحہ اور سامان مہیا کرے گا، اللہ اس کی مغفرت کرے گا'' وہ میں ہی تھا جس نے اسے کیل اور کانٹے سے لیس کیا۔ لوگوں نے ان باتوں کی تائید کی تو انھوں نے کہا: اے اللہ! گواہ رہ، اے اللہ! گواہ رہ، اے اللہ! گواہ رہ، پھر چلے گئے۔ ایک بار وہ اس دریچے پر آئے جو مسجد نبوی کے مقام جبرئیلؑ کے پاس ہے اور جمع ہونے والے ہجوم سے خطاب کیا۔ انھوں نے سوال کیا، کیا تم میں طلحہؓ بن عبید اللہ ہیں؟ تین بار پکارنے پر وہ سامنے آئے تو عثمانؓ ناراض ہوئے اور کہا، میرا خیال نہ تھا کہ تم ان لوگوں میں شامل ہو چکے ہو جنھیں بلانے کے لیے تین بار پکارنا پڑتا ہے۔ میں اللہ کا نام لے کر تم سے پوچھتا ہوں، کیا تمھیں یاد ہے، میں فلاں روز، فلاں جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ صحابہؓ میں سے میں اور تم محض دو افراد ہی موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں مخاطب کر کے فرمایا تھا، ''طلحہ! ہر نبی کا اس کے امتیوں میں سے ایک خاص ساتھی ہوتا ہے جو جنت میں بھی اس کے ساتھ رہے گا۔ یہ عثمانؓ جنت میں میرے رفیق ہوں گے۔'' طلحہؓ نے تائید کی تو عثمانؓ گھر کو پلٹ گئے۔

بلوے نے زور پکڑا تو حضرت عثمانؓ نے استفسار کیا، یہ لوگ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے، صرف تین وجوہ کی بنا پر کسی مسلم کی جان لی جا سکتی ہے۔ وہ مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو گیا ہو، اس نے شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد زنا کر لیا ہو یا کسی شخص کو بغیر کسی قصاص کے قتل کر ڈالا ہو۔ اللہ کی قسم، میں نے جاہلیت میں زنا کیا نہ اسلام میں، جب سے اللہ نے مجھے دین حق کی ہدایت کی ہے، میں نے اس سے روگردانی کی خواہش کی نہ میں نے کسی کو قتل کیا۔ پھر یہ مجھے کس جرم کی پاداش میں مار ڈالنا چاہتے ہیں؟ سیدنا عثمانؓ نے اللہ کو گواہ بنا کر لوگوں سے پوچھا، تمھیں یاد ہے، ایک دفعہ جبل حرا تھرتھرانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس پر پاؤں مار کر فرمایا تھا، ''حرا! پرسکون ہو جا، تجھ پر ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ایک صدیقؓ اور ایک شہیدؓ کے سوا کوئی نہیں۔'' میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ لوگوں نے کہا، یہ سچ ہے تو انھوں نے مزید کہا، میں ان اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی قسم دلا کر ان سے پوچھتا ہوں جو بیعت رضوان (صلح حدیبیہ) میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے مکہ بھیج چکے تھے، پھر جب بیعت کا موقع آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک دوسرے ہاتھ پر رکھ کر میری طرف سے بیعت لی اور فرمایا: یہ میرا ہاتھ ہے اور یہ عثمان کا۔ حاضرین نے اس بات کی بھی تائید کی۔

باغیوں نے سیدنا عثمانؓ کے ہر استدلال کو رد کیا۔ انھوں نے اپنے انتخاب کا ذکر کیا کہ وہ مسلمانوں کی مشاورت سے، ان کی رضا مندی کے ساتھ ہوا تو انھوں نے کہا، اللہ نے اس انتخاب کو ہماری آزمایش کا ذریعہ بنایا۔ جب حضرت عثمانؓ نے اسلام کی طرف اپنی سبقت اور دین حق کے لیے اپنی خدمات بیان کیں تو وہ بولے یہ سب بجا لیکن اب آپ بدل گئے ہیں۔ انہوں نے یہ فرمان نبویؐ سنایا کہ تین طرح کے مسلمانوں کے علاوہ کسی مومن کی جان لینا جائز نہیں تو بلوائیوں نے کہا، قرآن مجید میں حسب ذیل لوگوں کی جان لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ شخص جو زمین میں فساد مچاتا پھرے، جو بغاوت اور قتال کرے اور جو کسی حق کو روک لے اور اس کے لیے ہتھیار بھی اٹھائے۔ آپ نے خلافت کو ہمارے خلاف ہتھیار بنا لیا ہے۔ آپ اس خلعت کو اتار دیں، ہم بھی جنگ سے باز آ جائیں گے۔

ایام حج قریب تھے۔ ام المومنین سیدہ عائشہؓ نے بیت اللہ کا قصد کیا تو کچھ لوگوں نے یہ کہہ کر انھیں رکنے کو کہا، ہو سکتا ہے بلوائی آپ کی موجودگی سے شرم کریں اور شر سے باز آ جائیں۔ انھوں نے جواب دیا، مجھے اندیشہ ہے، میں نے انھیں کوئی سمجھاؤ دیا تو میرے ساتھ وہی سلوک نہ کریں جو انھوں نے ام المومنین ام حبیبہؓ (رملہؓ بنت ابوسفیانؓ) کے ساتھ کیا ہے۔ وہ بنو امیہ کے یتیموں اور ان کی بیواؤں کے بارے میں بات کرنے لیے خچر پر سوار ہو کر حضرت عثمانؓ کے پاس آئی تھیں۔ باغیوں نے خچر کا تنگ (زین کا تسمہ) کاٹ ڈالا تو وہ بدک کر بھاگا۔ اگر آس پاس کھڑے ان کے خادم خچر کو قابو نہ کر لیتے تو ان کے گر کر جان سے ہاتھ دھونے کا امکان تھا۔ ان حالات میں خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کا حج کے لیے جانا ناممکن تھا۔ انھوں نے حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کو اپنی طرف سے امیر حج مقرر کیا تو انھوں نے کہا، حج پر جانے سے بہتر ہے کہ میں آپ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آپ کا دفاع کروں تاہم حضرت عثمانؓ کے اصرار پر وہ مدینہ کے حاجیوں کو لے کر عازم سفر ہو گئے۔ شر پسندوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو صحابہؓ کی اکثریت بھی گھروں میں مقید ہو گئی تاہم ان میں سے نوجوان حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہؓ بن زبیر اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ خلیفۃ المسلمین کے دفاع پر مامور ہو گئے۔ اس وقت تک کسی کے ذہن میں نہ تھا کہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عثمان کو شہید بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ محاصرہ ایک ماہ سے زیادہ (یا ۴۰ دن) جاری رہا۔اس دوران میں غافقی بن حرب مسجد نبوی میں جماعت کی امامت کرتا رہا، کچھ نمازیں حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ، حضرت ابو ایوبؓ (خالدؓ بن زید) اور حضرت سہلؓ بن حنیف نے پڑھائیں۔حج ہو چکا، کچھ لوگ مدینہ واپس آئے اور بتایا، اکثر حجاج کرام مدینہ آنا چاہتے ہیں تاکہ باغیوں کو ان کے بلوے سے روک سکیں۔ یہ اطلاع بھی آئی کہ حبیب بن مسلمہ کی قیادت میں بھیجا ہوا حضرت معاویہؓ کا لشکر مدینہ کے قریب آ چکا ہے۔مصر سے معاویہ بن خدیج کی کمان میں آنے والی ابن ابی سرح کی فوج کسی وقت پہنچ سکتی ہے۔کوفہ سے قعقاع اور بصرہ سے مجاشع اپنے اپنے جیش لے کر نکلے ہوئے ہیں۔ باغیوں نے یہ جان کر محاصرہ تنگ کر دیا اور کسی مدد کے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی سیدنا عثمانؓ کو شہید کر ڈالا۔

شہادت سے پہلے حضرت عثمانؓ نے باغیوں کے ایک لیڈر اشتر نخعی کو بلا کر پوچھا،تمھارے کیا کیا مطالبات ہیں؟اس نے کہا، آپ اپنے آپ کو خلافت سے الگ کر لیں یا اپنی جاری کردہ تمام سزاؤں کا فدیہ دیں ورنہ آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ پہلے وہ کہہ چکے تھے، تمام گورنروں کو ہٹا کر ان کی مرضی کے گورنر مقرر کیے جائیں۔اگر عثمانؓ استعفا نہیں دینا چاہتے تو مروان کو ان کے سپرد کر دیں۔ حضرت عثمانؓ نے یہ کہہ کر خلافت چھوڑنے سے انکار کیا، وہ اس قمیص کو نہ اتاریں گے جو اللہ نے ان کو پہنائی ہے۔قصاص نہ دینے کا سبب یہ بتایا کہ وہ عمر رسیدہ اور ضعیف البدن ہیں اور مروان کو باغیوں کے حوالے اس لیے نہیں کرنا چاہتے کہ اس طرح وہ ایک مسلمان کے ناحق قتل کا سبب بن جائیں گے۔انھوں نے انتباہ کیا، اگر تم نے مجھے قتل کر دیا،تمھاری باہمی الفت ختم ہو جائے گی پھر اکٹھے نماز پڑھ سکو گے نہ دشمن سے ایک جان ہو کر لڑ سکو گے۔اپنی خلافت پر حضرت عثمانؓ کے اصرار کا سبب وہ ارشاد نبوی تھا جو حضرت عائشہؓ کی اس روایت میں ذکر ہوا۔فرماتی ہیں: میں نے ایک بار سنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم عثمان کو تلقین فرما رہے تھے، ''ہو سکتا ہے اللہ تمھیں ایک قمیص (خلعت خلافت) پہنائے۔پھر اگر کوئی اس قمیص کو اتارنے کی کوشش کرے تو مت اتارنا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم تین بار ارشاد کیا۔محاصرے کے بعد پہلا جمعہ آیا، ابن عدیس بلوی نے خطبہ دیا اور حضرت عثمانؓ کی عیب جوئی کی۔عثمانؓ نے فرمایا: میں نے جب سے اسلام قبول کیا، ہر جمعہ کے دن ایک غلام آزاد کرتا رہا ہوں۔ یہ پہلا جمعہ ہے کہ میں کوئی گردن قید غلامی سے نہیں چھڑا سکا۔ذی قعد کی درمیانی تاریخوں سے ۱۸ ذی الحجہ تک یہ محاصرہ جاری رہا۔۱۲ ویں دن باغیوں نے حضرت عثمانؓ سے ملاقات پر پابندی لگا دی اور ہر طرح کی رسد بند کر دی حتیٰ کہ انھیں پانی پہنچانا بھی مشکل ہو گیا۔شہادت سے ایک دن پہلے خلیفۂ ثالث نے اپنے گھر میں موجود ۷۰۰ کے قریب صحابہ سے جن میں عبداللہؓ بن عمر، عبداللہؓ بن زبیرؓ، حسنؓ، حسینؓ اور ابوہریرہؓ شامل تھے عہد لیا کہ وہ اپنے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

گھروں کو لوٹ جائیں گے اور تلوار نہ اٹھائیں گے۔ انھوں نے اپنے غلاموں کو تلقین کی، جو اپنی تلوار نیام سے نہ نکالے گا، آزاد ہو گا۔

آخر کار امیر المومنین عثمان غنیؓ کی زندگی کا آخری دن آ گیا۔ انھوں نے اس حال میں روزہ رکھا کہ پینے کے لیے پانی نہ تھا، ان کے ہمسایہ آل عمروؓ بن حزم کی طرف سے خفیہ طور پر پہنچایا ہوا پانی بھی ختم ہو چکا تھا۔ باغیوں نے ان کے بھوکے پیاسے ہونے کا ذرا احساس نہ کیا، کوڑے دان میں پڑے ہوئے گندے پانی کی طرف اشارہ کیا اور کہا، اسے استعمال کریں۔ روزہ رکھنے کے بعد سیدنا عثمانؓ نے خلاف معمول تہ بند کے بجائے شلوار پہنی، کچھ نوافل ادا کیے پھر مصحف سامنے رکھ کر سورۂ طٰہٰ کی تلاوت شروع کر دی۔ وہ تلاوت میں مصروف تھے کہ کچھ لوگ ان کے پڑوسی عمروؓ بن حزم انصاری کی دیوار پھلانگ کر گھر میں گھسے اور دروازے کو آگ لگا دی۔ دروازے پر سخت مزاحمت ہوئی جس میں کئی مسلمان شہید ہوئے، زیاد بن نعیم، مغیرہ بن اخنس اور نیار بن عبداللہ ان میں شامل تھے جب کہ عبداللہؓ بن زبیرؓ، حسنؓ بن علیؓ اور مروان بن حکم زخمی ہوئے۔ کچھ باغیوں کی جانیں بھی گئیں۔ آخر کار وہ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ سب سے پہلے ایک مصری اسود آیا اور زور سے حضرت عثمانؓ کا گلا گھونٹا پھر محمد بن ابوبکرؓ تیرہ آدمیوں کے ساتھ پہنچا۔ اس نے حضرت عثمانؓ کو ڈاڑھی سے کھینچ کر اس شدت سے اٹھایا کہ ان کے دانتوں کے ٹکرانے کی آواز آئی پھر چلایا، اب معاویہؓ اور ابن عامر آپ کو کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: او بھتیجے! میری ڈاڑھی چھوڑو۔ تم نے اس (شخص کی) ڈاڑھی پر ہاتھ ڈالا ہے، تمھارا باپ جس کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس نے کہا، میرے ابا اب آپ کو دیکھتے تو نکیر کرتے۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا، میں تمھارے خلاف اللہ سے مدد مانگتا ہوں۔ وہ پیچھے ہٹ گیا، لیکن اپنے ایک ساتھی کنانہ بن بشر کو اشارہ کر دیا جس نے لپک کر نیزے سے حملہ کیا۔ اس کے کھبنے سے گہرا زخم آیا اور حضرت عثمانؓ گر گئے۔ پھر ایک باغی آیا اور تلوار چلا کر ان کا ہاتھ زخمی کر دیا۔ ان کا خون ٹپک کر ان کے سامنے پڑے قرآن مجید کے نسخے پر گرنے لگا۔ باقی لوگ بھی پل پڑے، سیدنا عثمانؓ نے مدافعت کرنے کی کوشش کی، لیکن باغی غالب آ گئے۔ انھیں کچھ ہوش تھا کہ محمد بن ابوبکرؓ پلٹ کر آیا اور بولا، او لمبی ڈاڑھی والے یہودی! تم کس دین کے پیروکار ہو؟ انھوں نے جواب دیا، میں مسلمان ہوں اور اہل ایمان کا امیر ہوں۔ اسود بن حمران (یا سودان بن رومان) نے تلوار سے سینہ گھائل کیا، اس مرحلے پر آپ کی اہلیہ نائلہ حائل ہوئیں، وہ کود کر آپ پر گر گئیں اور چلائیں، تم امیر المومنین کو قتل کر رہے ہو؟ انھوں نے تلوار کو ہاتھ سے پکڑ لیا، لیکن اس نے تلوار زور سے کھینچ لی جس سے ان کی انگلیاں کٹ گئیں۔ نائلہ پیچھے ہٹیں تو اس نے تلوار حضرت عثمانؓ کے پیٹ میں گھونپ کر اس پر اپنا بوجھ ڈال دیا حتیٰ کہ

ان کی روح پرواز کر گئی۔ آخر میں عمرو بن حمق سینے پر چڑھ گیا اور اس پر کئی گھاؤ لگائے۔ مصحف ان کے ساتھ چپکا رہا، بد بخت غافقی بن حرب نے ان کے سر پر ٹھوکر مار کر اسے الگ کیا۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۳۸ ’’فان آمنوا بمثل آمنتم به فقد اهتدوا و ان تولو ا فانما هم فی شقاق فسيكفيكهم الله و هو السميع العليم ۔‘‘ (پھر اگر یہ (قریش) اسی طرح ایمان لے آئے جیسے تم لائے ہو تو راہ یاب ہو جائیں گے اور اگر انھوں نے روگردانی کی تو یقیناً وہ تمھاری مخالفت میں مبتلا ہیں۔ پس ان کے مقابلے میں تمھیں اللہ ہی کافی ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے کے الفاظ فسيكفيكهم پر آپ کا خون گرا ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے ایک غلام نے ان کے قتل میں شامل سودان کی گردن اڑا ڈالی، قتیرہ نے اسے شہید کر دیا۔

خلیفۂ مظلومؓ کو شہید کرنے کے بعد بلوائی ان کا سر کاٹنا چاہتے تھے۔ ان کی بیویاں نائلہ اور ام بنین اور ان کی بیٹیاں چلائیں اور روئیں پیٹیں تو عبدالرحمان بن عدیس نے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا۔ جاتے جاتے انھوں نے گھر کا ساز و سامان لوٹ لیا حتیٰ کہ پیالے اور برتن بھی اٹھا لیے۔ باغی نکل کر گھر کے صحن میں آئے تو امیر المومنینؓ کے ایک اور غلام نے کود کر قتیرہ پر حملہ کیا اور اسے جہنم واصل کر دیا۔ ایک بلوائی کلثوم تجیبی نے نائلہ کی چادر اٹھائی تو اس نے اسے بھی مار ڈالا۔ پھر وہ خود بھی شہید ہوا اور اپنے آقا پر اپنی جان نثار کر دی۔ اب خارجیوں کا رخ بیت المال کی طرف تھا، اس میں کافی مال تھا جو وہ لوٹ مار کر چلتے بنے۔ مشہور روایت کے مطابق سیدنا عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ ۴۰ دن جاری رہا۔ شعبی کا کہنا ہے، یہ ۲۰ دنوں سے کچھ اوپر تک چلا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت بروز جمعہ، ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو دوپہر کے وقت ہوئی جب ان کی عمر ۸۲ برس سے اوپر تھی۔ مدت خلافت عثمانیؓ ۱۲ روز کم ۱۲ سال بنتی ہے۔

حضرت عثمانؓ کی لاش ۳ دن بے گور و کفن پڑی رہی۔ تب حکیمؓ بن حزام اور جبیرؓ بن مطعم نے حضرت علیؓ کی اجازت سے تدفین کا ارادہ کیا۔ ان کی آخری آرام گاہ جنت البقیع کے مشرق میں حش کوکب کے مقام پر بنائی گئی۔ یہاں کھجوروں کا ایک باغ تھا جو خود حضرت عثمانؓ نے خریدا تھا۔ جنازے میں حکیمؓ بن حزام، حویطبؓ بن عبدالعزی، ابوجہم بن حذیفہ، نیارؓ بن مکرم، جبیرؓ بن مطعم، زیدؓ بن ثابتؓ، کعبؓ بن مالک، طلحہؓ، زبیرؓ، علیؓ اور حسنؓ شامل ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی دونوں بیویاں نائلہ اور ام بنین، ان کے بچے اور کچھ خادم بھی موجود تھے۔ خوارج نے جنازے میں بھی رکاوٹیں ڈالیں، وہ خلیفۂ مظلوم کی میت کو سنگسار کرنے کے لیے راستے میں بیٹھے رہے اور ان کے جسد کو چارپائی سے گرا کر بے حرمتی کرنا چاہی۔ انھوں نے زور لگایا کہ مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ کو دیر سلع میں یہودیوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ حضرت علیؓ نے انھیں ان کے ارادوں سے باز کیا پھر بھی جنت البقیع میں قبر نہ کھودی جا سکی۔ اس کی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بجائے تدفین اصل قبرستان کی دیوار کے باہر ہوئی۔شہادت پانے والے حضرت عثمانؓ کے دو غلاموں کو بھی حش کوکب میں ان کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔حضرت معاویہؓ نے اپنے عہد حکومت میں حش کوکب اور بقیع غرقد کی درمیانی دیوار گرا دی اور لوگوں سے کہا، اپنے متوفیوں کو حضرت عثمانؓ کی قبر کے پاس دفن کریں اس طرح یہ مقام بھی جنت البقیع کا حصہ بن گیا۔ بنوامیہ نے اپنے عہد حکومت میں حضرت عثمانؓ کے مزار پر ایک بڑا قبہ بنوایا جسے ترکیوں نے خوب مزین کیا۔سعودی حکومت نے اسے مسمار کرا دیا تاہم اب ان کی قبر کے اردگرد ٹائلیں لگا کر اسے ممیّز کر دیا گیا ہے۔

مطالعۂ مزید:الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)،البدایہ و النہایہ (ابن کثیر)،عثمان بن عفان (محمد حسین ہیکل)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ:امین اللہ وثیر)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الطاف احمد اعظمی

قرآن مجید کے بنیادی علوم

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

قرآن میں پانچ قسم کے علوم کا ذکر ہوا ہے۔ان علوم کو علماء کی تشریح کے مطابق علمِ تذکیر بآلاءِ اللہ، علمِ احکام، علمِ عقائد، علمِ تاریخ، علمِ موعظت اور علمِ آخرت کہا جا سکتا ہے۔بعض علماء نے ان علوم کو بالاختصار علم توحید، علمِ رسالت اور علمِ آخرت بھی کہا ہے۔شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن کے جملہ علوم کی زمرہ بندی اس طرح کی ہے[1]:

(۱) علمِ احکام: واجب، مستحب، مکروہ، حلال وحرام۔ان احکام کا تعلق عبادت، تدبیرِ منزل (معاشرت) اور سیاست مدن وغیرہ سے ہے۔

(۲) علمِ مناظرہ: چاروں گم راہ فرقوں، یعنی یہود ونصاریٰ، مشرکین اور منافقین کے بارے میں بحث۔

(۳) علمِ تذکیر بآلاءِ اللہ: اللہ کی نشانیوں اور انعامات کا ذکر، یعنی تخلیقِ ارض وسما اور خدا کی صفات کاملہ کا بیان۔

(۴) علمِ تذکیر بایّامِ اللہ: ان واقعات کا ذکر جو خدا کی اطاعت کرنے والوں کی جزا اور مجرموں کی سزا سے متعلق ہیں۔

(۵) علمِ تذکیر بالموت: حشر ونشر، حساب، میزان اور جنت ودوزخ کا بیان۔

جدید دور کے علماء وفضلاء نے علومِ قرآن کی تقسیم ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے کی ہے۔اس سلسلے میں علامہ اقبال نے حکیم عرشی امرت سری سے ایک بار دورانِ گفتگو فرمایا کہ ''علم کے چار ذریعے ہیں اور قرآن مجید نے ان چاروں کی طرف رہ نمائی کی ہے۔مسلمانوں نے ان کی تدوین کی اور دنیائے جدید اس باب میں ہمیشہ مسلمانوں کی منت کش

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، باب اوّل، ص ۶

رہے گی۔ پہلا ذریعہ وحی ہے اور وہ ختم ہو چکا ہے۔ دوسرا ذریعہ آثارِ قدیمہ اور تاریخ ہے جس پر قرآن کی آیات متوجہ کر رہی ہیں۔ ''سیروا فی الارض''، اس آیت سے علمِ آثار کی بنیاد رکھ دی جس پر مسلم مصنّفین نے عالی شان قصر تعمیر کیے۔ ''ذکّر ھم بایّام اللّٰہ''، یہ آیت تاریخ کا ابتدائی نقطہ ہے جس نے ابن خلدون جیسے با کمال محقق پیدا کیے۔ علم کا تیسرا ذریعہ علم النفس ہے جس کا آغاز ''وفی انفسکم افلا تبصرون'' سے ہوتا ہے۔ اس علم کو حضرت جنید بغدادیؒ اور ان کے رفقاء نے کمال تک پہنچایا۔ آخری ذریعہ صحیفۂ فطرت ہے، جس پر قرآن کی بے شمار آیات دلالت کر رہی ہیں، مثلاً ''والی الارض کیف سطحت''۔ اس پر علماء اندلس نے بہت توجہ مبذول کی۔ (اس کے بعد) علامہ اقبال نے کہا کہ موجودہ دنیا اپنے تمام علوم وتہذیب اور صنائع وبدائع سمیت مسلمانوں کی مخلوق ہے[۲]۔''

راقم کے نزدیک قرآن کے علومِ پنجگانہ کی مذکورہ تشریح میں کئی نقائص اور کمیاں ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کو کسی افراط وتفریط کے بغیر اس طرح بیان کیا جائے جس طرح قرآن میں ان کا ذکر آیا ہے۔ علماء کی تقسیمِ علوم اور ان کی اصطلاحوں کو باقی رکھتے ہوئے آگے علوم قرآن کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) علمِ تذکیر بآلاءِ اللہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصّہ وہ ہے جس کا تعلق ان بے شمار نعمتوں سے ہے جو اس کائنات کے گوشے گوشے میں بکھری ہوئی ہیں اور انسان ان سے شب وروز متمتّع ہوتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ان نعمتوں سے مستفید ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے خالق ومحسن کو پہچانیں اور اس کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اس کا حق بھی ادا کریں۔ قرآن میں بکثرت مقامات پر ان نعمتوں کی طرف انسانوں کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے تاکہ انھیں محسنِ حقیقی کا عرفان حاصل ہو۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ. اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا. ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا. فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا. وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا. وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا. وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا. وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا. مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ. (عبس ۸۰: ۲۴-۳۲)	''انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کو دیکھے، ہم نے خوب پانی برسایا، پھر زمین کو پھاڑا، پھر اس کے اندر غلّے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجوریں، گھنے باغ اور میوے اور چارے اُگائے، تمہارے لیے سامانِ زیست کے طور پر اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی۔''

دوسری جگہ فرمایا:

[۲] ماہنامہ البیان، امرت سر، دسمبر ۱۹۳۶ء

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْ م بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ. (النحل ۱۶:۶۶)

''اور تمھارے لیے چوپایوں میں بھی جائے غور وفکر ہے۔ ان کے شکم میں گوبر اور خون کے درمیان سے ہم تمھیں ایک چیز پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ط اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ. قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (قصص ۲۸:۷۱-۷۳)

''اے پیغمبر ان سے کہو، کیا تم لوگوں نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ رات ہی طاری رہنے دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمھارے لیے روشنی لائے۔ کیا تم اس بات پر کان نہ دھرو گے؟ ان سے کہو، کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ دن ہی رہنے دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھیں رات لا کر دے، جس میں تم آرام پاؤ۔ کیا تم (خدا کی اس نعمت کو) دیکھتے نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون و راحت پاؤ اور دن میں اپنے رب کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو اور تاکہ تم (ان نعمتوں پر) اس کا شکر ادا کرو۔''

ایک اور مقام پر بڑے بلیغ اسلوب میں فرمایا گیا ہے:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ. ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ. لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ. اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ. بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ.

''کیا تم نے کبھی سوچا، یہ جو تم کھیتی کرتے ہو، اس کو تم (زمین سے) اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم باتیں ہی بناتے رہو کہ ہم تو تاوان زدہ ہو گئے،

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

اَفَرَءَ يْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ. ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ. لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُوْنَ. اَفَرَءَ يْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ. ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ. نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ. (واقعہ ۵۶: ۶۸-۷۳)

کیا کبھی تم نے سوچا، یہ پانی جو تم پیتے ہو اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کو ہم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری بنا دیں۔ (جب حقیقت یہ ہے تو) پھر تم شکر گزار کیوں نہیں بنتے؟ تم نے کبھی سوچا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، اس کے درخت تم نے پیدا کیے ہیں یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی اور صحرا کے مسافروں کے لیے فائدے کی چیز بنایا ہے۔''

جن نعمتوں کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا، وہ خدا کی بالکل کھلی ہوئی نعمتیں ہیں اور ہر عالم و جاہل ہر روز انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگ محسنِ حقیقی کے عرفان سے قاصر رہتے ہیں۔

علمِ تذکیر بآلاءِ اللہ کا دوسرا حصہ وہ ہے جو کائنات کے آثار و حوادث سے تعلق رکھتا ہے۔ آثار و مظاہر فطرت دراصل خدا کے علم و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ اگر ایک صاحب علم انسان کھلے دل و دماغ کے ساتھ آثارِ کائنات پر غور و فکر کرے تو وہ ہر قدم پر محسوس کرے گا کہ یہ کائنات کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے، بلکہ ایک عزیز و قدیر اور علیم و حکیم ہستی کا کارخانۂ خلق و ایجاد ہے، جہاں ہر طرف حیران کن علم کی جلوہ گری اور بے مثال نظم و قانون کی حکمرانی ہے۔ ایک ہی طاقت و ارادہ ہے جو ہر جگہ غالب و نافذ ہے۔ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک نظامِ عمل کی پابند ہے اور ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے دائرہ سے ایک ثانیہ کے لیے بھی قدم باہر نکال سکیں۔

قرآن کی متعدد آیات میں کائنات کی اس حکیمانہ خوبی اور اس کے حیرت انگیز نظم و قانون کی طرف تمام ہوش مند انسانوں کو متوجہ کیا گیا ہے اور اربابِ علم و عقل کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ اس ہستی برتر کا انھیں عرفان حاصل ہو جو اس کائناتِ بے کراں کی خالق و آمر ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات بڑی اہمیت رکھتی ہیں:

(۱) اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ.

''کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا؟ ہم نے اسے کیسا بنایا اور کس خوبی سے

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ م بَهِيْجٍا. تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ. (ق۵۰:۶-۸)

اس کو آراستہ کیا ہے۔ اس میں کہیں کوئی شگاف نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ نصب کیے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش نما چیزیں اُگائیں۔ اس میں سامانِ دید ہے اور یاددہانی بھی، ہر اس بندے کے لیے جو (خدا کی طرف) رجوع کرنے والا ہو۔''

(۲) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍقف وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ. (رعد۱۳:۴)

''اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے کئی خطّے ہیں، انگور کے باغ ہیں اور کھجور کے درخت ہیں، جن میں کچھ اکہرے (ایک تنہ والے) اور کچھ دوہرے (دو تنہ والے)، سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزہ میں ہم ایک کو دوسرے پر برتری دیتے ہیں۔ ان چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

(۳) وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ. (روم۳۰:۲۲)

''اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اصحابِ علم و دانش کے لیے۔''

(۴) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًج فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَاط وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌم بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَط اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے ہم نے پھل پیدا کیے، جن کے رنگ مختلف ہیں۔ اور پہاڑوں کے بھی مختلف حصّے ہیں (بعض) سفید اور سرخ، ان کے بھی رنگ مختلف ہیں، اور (بعض) بہت گہرے سیاہ رنگ کے۔ اسی طرح آدمیوں، جانوروں اور چوپایوں کے رنگ بھی

عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ. (فاطر۳۵: ۲۷-۲۸)

مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے وہی لوگ اس سے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ بے شک، اللہ بڑا زبردست اور بہت بخشنے والا ہے۔''

ان آیات سے بالکل واضح ہے کہ قرآن میں خدا شناسی کے جو دلائل دیے گئے ہیں، وہ انسان کی عقل اور اس کی فطرت، دونوں کو بغایت اپیل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عقل پختہ اور تربیت یافتہ ہو اور خارجی اثرات سے مغلوب ہو کر کج رو اور کج اندیش نہ ہو گئی ہو تو کائنات کے آثار و حوادث کے مشاہدہ سے وہ حقیقت الحقائق (Ultimate Truth) تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ اسی بات کو اوپر کی آیت میں ''انما یخشی اللّٰہ من

۳؎ سر جیمز ایک ممتاز ماہر علم ہیئت، عظیم ریاضی داں اور ایک جید عالم طبیعیات (Physicist) گزرے ہیں۔ ایک عالمِ طبیعیات کی حیثیت سے ''نظریۂ گیس'' اور ''اشعاع'' کے باہمی تعلق اور آزاد الکٹران کے مختلف پہلوؤں پر ان کی فاضلانہ تحقیقات اور عالمانہ آراء ناقابلِ فراموش ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنسی دنیا ایک عظیم المرتبت سائنس داں کی حیثیت سے ان کے کارہائے نمایاں کو ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

۱۹۰۶ء میں وہ کل ۲۸ سال کی عمر میں رائل سوسائٹی کے فیلو منتخب کر لیے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے ان کے ایک مضمون ''نظریۂ تخلیق اور کوکبی حرکیات کے مسائل'' پر انھیں آدمس پرائز دے کر ان کی عزت افزائی کی۔ کیمبرج فلاسوفیکل سوسائٹی نے بھی ''نظریۂ گیس''، ''اشعاع'' اور ''سیاراتی نظام کے ارتقاء'' پر ان کی گراں قدر تحقیقات پر انھیں ہاپ کنس پرائز عطا کیا۔ سائنس کی دنیا میں ایک ماہر علمِ فلکیات کی حیثیت سے ان کا مقام نہایت بلند ہے۔ نظریۂ تخلیق سے متعلق ان کی فاضلانہ تحقیقات پر سر آتھر ایڈنگلٹن نے انھیں رائل اسٹرونومیکل سوسائٹی کا سنہری تمغہ پیش کیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک وہ اس سوسائٹی کے صدر رہے۔ ہندوستان میں کلکتہ اور بنارس جیسی معروف یونیورسٹیوں نے انھیں آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دیں۔ سائنس سے متعلق انڈین ایسوسی ایشن نے ۱۹۳۷ء میں انھیں ''مکر جی میڈل'' دیا۔ اسی سال بنگال کی ایشیائی سوسائٹی نے بھی انھیں میڈل دے کر ان کا رتبہ بڑھایا۔ ۱۹۲۸ء میں ''نائٹ ہوڈ'' اور ۱۹۳۹ء میں ''آرڈر آف دی میرٹ'' جیسے بلند اعزازات سے نوازے گئے۔

سر جیمز نے مختلف موضوعات پر متعدد عالمانہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

Mysterious Universe, Astronomy and Cosmogony. Universe Around

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عبادہ العلماء'' کہا گیا ہے۔

میں یہاں دورِ جدید کے ایک ممتاز ریاضی داں اور ماہرِ علم فلکیات (Astronomer) سر جیمز جینس (Sir James Jeans) سے متعلق ایک واقعہ ذکر کروں گا جس کے راوی علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''۱۹۰۹ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمس جینز پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، ''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا دو باتیں۔ اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق عالمِ سائنس گرجا میں عبادت کے لیے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جمیز لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ ٹھیک ۴ بجے لیڈی جیمز نے باہر آ کر کہا، ''سر جیمز تمہارے منتظر ہیں۔'' اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے، کہنے لگے، ''تمھارا کیا سوال تھا؟'' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشمکش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت وخشیّت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے، عنایت اللہ خاں! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں ''تو بہت بڑا ہے'' تو میری ہستی کا ہر ذرّہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے۔ کہو عنایت اللہ خاں،

---

us. Introduction to the Kinetic Theory of Gases.

یہ ان کی آخری تصنیف ہے جو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں لکھی۔ اس کے ۴ سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ (مصنف)

تمھاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں۔

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا۔ میں نے کہا، جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آ گئی ہے، اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔ فرمایا، ضرور۔ چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:

وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌم بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ. وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا. (فاطر ۳۵: ۲۷-۲۸)

’’پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں، (بعض) سفید اور سرخ، ان کے بھی رنگ مختلف ہیں، اور (بعض) بہت گہرے سیاہ رنگ کے۔ اور اسی طرح آدمیوں، جانوروں اور چوپایوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ اللہ کے بندوں میں سے صرف اہلِ علم ہی اس سے ڈرتے ہیں۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے، کیا کہا، اللہ سے صرف اہلِ علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب۔ یہ بات مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد کو کس نے بتائی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمدؐ اَن پڑھ تھے۔ انھیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی۔ انھیں یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب، بہت عجیب[۴]۔

علامہ مشرقی سے پروفیسر جیمز کی مذکورہ گفتگو ایک دفترِ بصیرت اور ہر صاحب نظر کے لیے ایک ایمان افروز سبق۔ اس عجیب و غریب واقعہ کا ذکر مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے بھی اپنے رسالہ ’’صدق‘‘ مورخہ ۲/ فروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں کیا ہے۔

(۲) علمِ احکام کا تعلق بندۂ مومن کے طرز عمل سے ہے۔ خدا کی ذات پر ایمان لانے کے بعد اس پر بقدرِ استطاعت خدا کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی پابندی لازم ہو جاتی ہے۔ یہ احکام دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق اعمالِ پرستش سے ہے۔ یہ احکام عبادت ہیں اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ دوسرے وہ احکام ہیں جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ اس زمرہ میں معاشرتی، اقتصادی و سیاسی اور اخلاقی احکام داخل ہیں۔ اخلاقی احکام کو چھوڑ کر بقیہ احکام میں حالاتِ زمانہ کی تبدیلی کے لحاظ سے حسب ضرورت ترمیم و اضافہ ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔

---

۴ نقوش، شخصیات نمبر، ص ۱۲۰۸، ۱۲۰۹

قرآن میں زیادہ تر احکام کے اصول وکلیات بیان کیے گئے ہیں اور بعض کے جزئیات بھی۔ان تمام کلی اور مخصوص جزئی احکام کے معنی ومفہوم کوقرآن میں مختلف طریقوں سے خوب اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔اب کسی شخص کوخواہ وہ اپنے وقت کا کتنا ہی بڑا عالم اورفقیہ کیوں نہ ہو، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے معنی ومفہوم میں کوئی ادنیٰ حذف واضافہ کرے۔علماء اورفقہاء کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کے کلی اصولوں کے مطابق صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنتوں میں زمانہ کے احوال وظروف کی رعایت کے ساتھ ہر دور میں جزئی احکام کی تخریج کریں۔

(۳)علمِ تذکیر بایّام اللہ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، دراصل علمِ تاریخ ہے۔اس کو مذہبی اصطلاح میں علمِ قصص کہا جاتا ہے۔یہ ایک مذہبی تاریخ ہے جس میں اخلاقی اور دعوتی عنصر غالب ہے۔اس اعتبار سے اس تاریخ کا دائرہ کافی وسیع ہے۔اس میں حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آخری نبیؐ تک کی اہم قوموں اوران میں مبعوث ہونے والے قابل ذکر پیغمبروں کے احوال وواقعات بیان کیے گئے ہیں۔

ان واقعات کے بیان کرنے کی ایک بڑی غرض انذار اورعبرت آموزی ہے۔چنانچہ ایک طرف آخری نبی کے مخاطبین کو بتایا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی دعوت نہیں ہے، بلکہ پچھلی دعوتوں ہی کی تجدید اوران کی تکمیل ہے،تو دوسری طرف حق کے منکرین کوخبردار کیا گیا ہے کہ سنت اللہ کے مطابق ایک دن ان کو بھی اسی انجامِ بد سے دوچار ہونا ہے جس سے ان سے پہلے کی سرکش قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔اسی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوتسکین وتشفی دی گئی ہے کہ حق و باطل کی اس لڑائی میں حق کوفتح حاصل ہوگی اور باطل سرنگوں ہوگا۔اس باب میں اللہ کی سنت نا قابلِ تغیر ہے۔مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَج وَجَآءَكَ فِي هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ. (سورۂ ہود۱۱:۲۰)

’’اوررسولوں کے احوال میں سے یہ سارے قصے ہم تم سے بیان کرتے ہیں(اورغرض یہ ہے) کہ ان کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کوتقویت دیں،(اس کو جمائے رکھیں)اور جوحق بات ان قصّوں میں ہےوہ تم تک پہنچ چکی ہےاور(اس میں) مومنوں کے لیےنصیحت اور یاددہانی ہے۔‘‘

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

حَتّٰی اِذَااسۡتَیۡئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّھُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا جَآءَ ھُمۡ نَصۡرُنَالا فَنُجِّیَ مَنۡ نَّشَآئُط وَلَایُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ. لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِھِمۡ عِبۡرَۃٌ لِّاُوۡلِی الۡاَلۡبَابِ. (سورۂ یوسف۱۲: ۱۱۰-۱۱۱)

''یہاں تک کہ پیغمبر بالکل مایوس ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ (کفار پر عذاب آنے کے معاملے میں) ان سے حق بات نہیں کہی گئی، (ٹھیک اس وقت) ہماری مدد ان کے پاس پہنچ گئی، پھر (اس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا بچا لیا اور ہمارا عذاب مجرموں سے پھرتا نہیں (یعنی واقع ہو کر رہتا ہے)۔ ان (انبیاء) کے قصوں میں عقل مندوں کے لیے عبرت ہے، (وہ ان سے سبق لیں۔''

تاریخی واقعات کے بیان سے قرآن کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ اہلِ ایمان اس سے یاددہانی حاصل کریں، جیسا کہ سورۂ ہود کی مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے ''و ذکریٰ للمومنین''۔ اس سلسلے میں قرآن میں خاص طور اہلِ کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی نافرمانیوں اور بداعمالیوں کے واقعات مکرّر بیان کیے گئے ہیں تاکہ مسلمان دیکھ لیں کہ ان کی دینی اور دنیوی بربادی کے اسباب کیا تھے۔ مثلاً یہودیوں کے مذہبی افتراق اور فرقہ بندی کے حوالے سے فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡم بَعۡدِ مَاجَآءَ ھُمُ الۡبَیِّنٰتُ. (سورۂ آل عمران۳: ۱۰۵)

''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو متفرق ہو گئے اور جنھوں نے اختلاف کیا جب کہ ان کے پاس حق کے واضح دلائل آ چکے تھے۔''

عیسائی علماء اور درویشوں کے خلافِ توحید افعال اور ان کے دنیا پرستی کے ذکر میں ارشاد ہوا ہے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّھۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِط وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّھَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَھَا فِیۡ

''اے ایمان والو، اکثر علماء اور مشائخ لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ (یعنی توحید) سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ (حبّ دنیا میں مبتلا ہونے کی وجہ سے) سونا اور چاندی کو ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سَبِيۡلِ اللّٰهِ لافَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ. میں اس کو خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک
(سورۂ توبہ ۹:۳۴) عذاب کی خبر دے دو۔‘‘

قرآنی قصص کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت اجمال کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ بعض قصّوں میں صرف اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ صرف تین سورتوں، یوسف، کہف، مریم، میں واقعات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اجمال ہو یا تفصیل، دونوں با مقصد ہیں۔ جہاں اجمال ہے وہاں ہدایت کے نقطۂ نظر سے اجمال ہی مطلوب ہے اور جہاں تفصیل ہے وہاں تذکیر کا پہلو متقاضی تھا کہ اس کو کھول کر بیان کیا جائے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ انسان کی فطرت میں قصہ گوئی کی طرف طبعی میلان پایا جاتا ہے اور قصوں سے اس کو یک گونہ شغف ہے۔ اگر داستان دلچسپ ہو تو اس کا یہ طبعی میلان اور بڑھ جاتا ہے۔ قصوں کی تفصیل سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کا ذہن داستان کی نیرنگی اور بوالعجبی میں کھو جاتا ہے اور اس کا تذکیری پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے۔ چونکہ قرآن کا مقصد داستان گوئی نہیں ہے، اس لیے ہر جگہ واقعات کے بیان میں اختصار کو ترجیح دی گئی ہے تا کہ عبرت و موعظت کا پہلو جو مقصودِ داستان ہے، نگاہوں سے اوجھل نہ ہو۔

بہت سے مفسرین نے قرآنی قصوں کے اجمال کی اس غرض و غایت کو نہیں سمجھا اور ان کی تفصیل کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کے مجمل قصوں کی تفصیل یا وضاحت کی غرض سے موضوع احادیث اور اسرائیلی روایات کو کسی نقد و تحقیق کے بغیر نقل کر دیا ہے، حتیٰ کہ بیہودہ روایات کو بھی قبول کر لیا گیا ہے۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر میں جو تفسیر طبری کا ملخّص ہے، ہاروت اور ماروت کی داستانِ عشق دیکھ لیں[۵]۔ اسی طرح ’وَلَقَدۡ فَتَنَّا سُلَيۡمٰنَ وَاَلۡقَيۡنَا عَلٰى كُرۡسِيِّهٖ جَسَدًا‘ (سورۂ ص ۳۴) کی تفسیر میں بالکل بے سروپا روایات بیان کی گئی ہیں[۶]۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ ’لقد فتنا سلیمان‘ کا محل جب کہ حدیث میں انشاء اللہ کے ترک کرنے اور اس پر مواخذہ کا ذکر ہوا ہے تو کیا ضرورت تھی کہ صخرہ کا قصہ بیان کیا جائے[۷]۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کے کسی مجمل قصہ کی تفصیل کرنا کوئی کارِ گناہ ہے۔ اصولی طور پر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ قرآن میں جہاں قصوں کے بعض جزئیات چھوڑ دیے گئے ہیں، ان کی تلاش و جستجو میں نہ پڑا جائے، کیونکہ

---

۵ تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۵۹

۶ تفسیر ابن کثیر، ج ۷، ص ۲۰۱ تا ۲۰۷

۷ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۷۷

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تذکیر کے لحاظ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ترک خوداس بات کی دلیل ہے کہ متروک اجزاء غیر ضروری تھے۔

قرآنی قصص کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اختلافی امور کونظر انداز کر کے قصّے کے مرکزی خیال کو اُجاگر کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر سورۂ کہف میں اصحابِ کہف اوران کے کتوں کی تعداد اور غار میں ان کی مدتِ قیام کے بارے میں پہلے سے مختلف رائیں تھیں (آیات ۲۲ تا ۲۵)، اس لیے قرآن نے ان کو مبہم ہی رہنے دیا اوران غیر ضروری باتوں کونظر انداز کر کے قصہ کی اصل روح کو نمایاں کیا ہے۔اور وہ یہ کہ نیکوکار بندوں کی مدد کے سلسلے میں خدا کا وعدہ سچا ہے (سورۂ کہف۔۲۱)۔لیکن مفسرین نے حسب عادت اس اختلافی مسئلے میں قیاس آرائی سے گریز نہیں کیا ہے۔

غیر نزاعی واقعات میں کسی اجمال کی تفصیل غیر محمود نہیں ہے۔جہاں محسوس ہو کہ اجمال کی تفصیل سے واقعہ زیادہ قابلِ فہم اوراس کا تذکیری پہلو مزید نمایاں ہوگا، یااس سے قرآن کا اعجاز ظاہر ہوگا، یااس سے قرآن کے کسی بیان کی تصدیق ہوگی تو وہاں تفصیل وتوضیح میں کوئی حرج نہیں ہے۔مثلاً درج ذیل آیات کی تفصیل مفید ہوگی:

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ. (سورۂ انبیاء۲۱:۱۰۵)

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ. (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷:۴)

وَمُبَشِّرًام بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْم بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ. (سورۂ صف ۶۱:۶)

اسی طرح سورۂ ابولہب، سورۂ کوثر اور سورۂ روم میں جو تاریخی پیشن گوئیاں ہیں، ان کی تفصیل میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ یہ تفصیل مفید ہوگی کیونکہ اس سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ان کے علاوہ وہ قصے جو قرآن میں مجمل لیکن تورات میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، ان کی تفصیل کی جا سکتی ہے۔اس سے تفہیم آیت میں مدد ملے گی۔ابتدائی چار سورتوں (بقرہ، آل عمران، نسآء، مائدہ) میں اہلِ کتاب سے متعلق ایسے کئی واقعات ہیں جو اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

قرآن میں بیان کردہ بعض واقعات تورات کے بیان سے مختلف ہیں۔اگر عقلی وعلمی اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ان واقعات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس سے قرآنی بیان کی صداقت ثابت ہوگی۔مثلاً آدم وحوا کا قصہ اور سلیمان علیہ السلام کی طرف علم سحر کی نسبت وغیرہ۔

(۴) علمِ مباحثہ کا تعلق اس طریقۂ استدلال سے ہے جو قرآن میں مشرکینِ عرب، منافقین مدینہ اور یہود و نصاریٰ کے عقائد واعمال کی تردید میں اختیار کیا گیا ہے۔اس کو معروف علمِ مناظرہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا جو تمام تر

جدلی اور کلامی نوعیت کا علم ہے۔ اس سے مذہبی نزاع تو کیا ختم ہوگی، اس میں کچھ مزید اضافہ ہو جائے گا۔ قرآن کا طریقۂ بحث ومجادلہ بالکل فطری اور سادہ مگر عقلی براہین پر مبنی ہے۔ مثلاً تعددِ الٰہ کی تردید میں جو عقلی دلیل دی گئی ہے وہ کتنی مضبوط اور فیصلہ کن ہے۔ فرمایا گیا ہے:

لَوْ کَانَ فِیْھِمَآ اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا. (سورۂ انبیاء ۲۱:۲۲)

''اگر آسمانوں اور زمین میں ایک اللہ کے علاوہ کوئی اور الٰہ ہوتا تو ان کا نظم وانتظام درہم برہم ہو جاتا۔''

شرک کی تردید میں آفات وحوادث کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ان نازک مواقع پر اکثر انسان سب سہاروں کو بھول کر خدا ہی کو پکارتے ہیں، بالخصوص ان حالات میں جب نجات کے سارے ظاہری اسباب ووسائل معدوم نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں شرک نہیں، توحید ہے۔ ماحول کے غلط اثر کی وجہ سے یہ اصل فطرت محجوب ہو جاتی ہے، لیکن مصائب اس عارضی حجاب کو اٹھا دیتے ہیں اور اس کی اصل فطرت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

ھُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط حَتّٰٓی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَجَرَیْنَ بِھِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَۃٍ وَّفَرِحُوْا بِھَا جَآءَ تْھَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَ ھُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِیْطَ بِھِمْ لا دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ج ە لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ ھٰذِہٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ. (سورۂ یونس ۱۰:۲۲)

''وہ اللہ ہی تو ہے جو تم کو خشکی اور تری، دونوں میں سفر کراتا ہے، حتیٰ کہ (بعض اوقات) جب تم کشتیوں میں سوار ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو بادِ موافق کے سہارے لے کر چلتی ہیں اور وہ اس سے شادمانی محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ (اچانک) بادِ مخالف کا ایک جھونکا آتا ہے اور سمندر کی لہریں ہر طرف سے ان پر آپڑتی ہیں اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ بالکل گھر چکے ہیں، (اس وقت) وہ خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دی تو ہم ضرور تیرے شکر گزار رہوں گے۔''

عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیتِ مسیح کی تردید میں جو عقلی دلیل دی گئی ہے، وہ مختصر لیکن انتہائی مسکت ہے۔ ارشاد ہوا ہے: کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ (سورۂ مائدہ ۵:۷۵) ''وہ دونوں (مریم وعیسیٰ) کھانا کھاتے تھے۔'' یہودیوں کو اپنی بداعمالیوں اور نافرمانیوں کے باوجود یہ گھمنڈ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذرّیت سب یہودی تھے۔ اور عیسائی

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

کہتے تھے کہ وہ سب عیسائی تھے (سورۂ بقرہ: ۱۴۰)۔ان کی اس خوش گمانی کے جواب میں نہایت مختصر لیکن دل میں اتر جانے والی بات کہی گئی ہے۔فرمایا ہے:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْج لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْج وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

(سورۂ بقرہ ۲: ۱۴۱)

''یہ (خدا رسیدوں کی) ایک جماعت تھی جو (دنیا سے) جا چکی، اس کے لیے اس کی کمائی ہے اور تمھارے لیے تمھاری کمائی، تم سے ان کے کاموں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔''

اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں، دونوں نے جہالت اور مذہبی تعصب کی وجہ سے ہدایت کے معاملے کو ایک قومی اور نسلی معاملہ بنا دیا تھا اور دعوے سے کہتے تھے کہ وہی لوگ ہدایت پر ہیں جو یہودی اور عیسائیوں کے بقول عیسائی ہیں۔ان کے اس زعمِ باطل کی تردید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ کو پیش کیا گیا جن کو یہ دونوں قومیں اپنا مقتدا مانتی تھیں اور کہا گیا کہ ہدایت یاب صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں۔ابراہیمؑ توحید کے علم بردار تھے جب کہ وہ شرک کی راہ میں چل رہے ہیں۔اس دلیلِ قاطع کو قرآن کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْاط قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًاط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.

(سورۂ بقرہ ۲: ۱۳۵)

''وہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا عیسائی تو ہدایت پا لو گے۔کہہ دو (کہ ایسا نہیں ہے)، ہدایت پر وہ ہے جس نے ابراہیم کا طریقہ اختیار کیا جو سب سے کٹ کر خدا کا ہو رہا تھا اور وہ مشرک نہیں تھا، (جب کہ ان کا دامن شرک سے آلودہ ہے)''

قرآن میں مثبت مباحثہ کے اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔فرمایا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ. (النحل ۱۶: ۱۲۵)

''اپنے رب کے (سیدھے) راستے کی طرف بلاؤ، حکمت (یعنی علمی دلائل) اور عمدہ نصیحت سے، اور (اگر بحث کی نوبت آ جائے تو پھر) اچھے ڈھنگ سے بحث کرو۔''

اس مجادلۂ حسنہ کی ایک عمدہ مثال قرآن ہی میں موجودہ۔ اس بحث کا تعلق حضرت ابراہیمؑ اور بادشاہِ بابل سے ہے جو خود کو رب سمجھتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا، میں بھی یہ کام کرتا ہوں (بقرہ۲:۲۵۸)

دیکھیں، بادشاہ کا یہ جواب حقیقت واقعہ کے خلاف تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس پر اعتراض کرنے کے بجائے کہ اس سے بحث دوسرے رخ پر چلی جاتی، ایک دوسری عقلی دلیل دی کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اگر تو اس کائنات کا رب (حاکم اعلیٰ) ہے تو اس کو مغرب سے نکال دے۔ یہ سن کر وہ لاجواب ہو گیا: فَبُهِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ (سورۂ بقرہ۲:۲۵۸)

مباحثہ کا ایک عمدہ طریقہ 'مباہلہ' بھی ہے۔ یہ طریقہ اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب فریقِ مخالف کسی طرح حق بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو اور اپنے خیال کی صحت پر مصر ہو۔ قرآن میں اس طریقہ کا ذکر ہوا ہے۔ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جس میں ان کے علماء بھی تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مدینہ آیا۔ ان کو مسجد نبوی میں ٹھیرایا گیا اور ان کے ساتھ نہایت کریمانہ سلوک کیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ گفتگو میں ان کو اسلام کی دعوت دی اور الوہیتِ مسیح کے عقیدے کی غلطی ان پر واضح کی[۸]۔ لیکن انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ ان کے عقیدے میں کوئی خرابی نہیں ہے، اس لیے وہ اسلام قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کج بحثی سے گریز کرتے ہوئے ان کو مباہلہ کی دعوت دی۔ قرآن میں ہے:

فَمَنۡ حَآجَّكَ فِیۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَكُمۡقف ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَی الۡكٰذِبِیۡنَ.

(سورہ آل عمران۳:۶۱)

''اب جب کہ تمھارے پاس (مسیح کے باب میں قطعی) علم آ چکا ہے تو جو شخص اس کے بعد بھی تم سے اس معاملہ میں حجّت کرے تو کہو کہ آؤ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو بلا لیں اور تم بھی اپنے بچوں اور عورتوں کو بلا لو اور خود ہم بھی اور تم بھی (ان میں شامل ہوں)، پھر ہم سب عاجزی سے دعا کریں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو۔''

۸۔ عیسائی علماء نے اپنے عقیدے کے اثبات میں حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے کو بطور دلیل پیش کیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ حضرت عیسیٰ کے تو باپ نہیں تھے، حضرت آدم کے تو نہ باپ تھے نہ ماں، پھر وہ کیسے پیدا ہو گئے اور پیدا ہو کر انسان ہی رہے، خدا نہیں ہو گئے (دیکھیں سورۂ آل عمران۳:۵۹)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لیکن عیسائی علماء مباہلہ کے لیے تیار نہیں ہوئے، کیونکہ انھیں اپنے عقیدے کی سچائی پر دل سے یقین نہیں تھا۔ یہ کام تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے عقیدے کی صحت پر کامل یقین واطمینان رکھتے ہوں۔ اور یہ لوگ اس یقین سے محروم تھے۔

(۵) قرآن کے علومِ پنجگانہ میں سے آخری چیز علمِ تذکیر بالموت ہے۔ اس علم کا تعلق وقوع قیامت، حشر ونشر، پرسشِ اعمال اور جزا وسزا یعنی جنت اور دوزخ کے احوال ومقامات کے بیان سے ہے۔ عالم آخرت کے احوال سے واقفیت کا ذریعہ صرف وحی ہے، کیونکہ عقل اس عالم کے ادراک سے قاصر ہے۔ اس علم کے مطابق ایک دن عالمِ مادی نیست ونابود ہو جائے گا اور ایک دوسرا عالم وجود میں آئے گا جہاں بندوں کو ان کے دنیوی اعمال کی جزا وسزا ملے گی۔

چونکہ اس عالمِ غیر ماڈی کے احوال ومعاملات کی تفصیل وتوضیح انسانی زبان میں جو ماڈی خواص رکھتی ہے، ممکن نہیں تھی، اس لیے قرآن میں ان کے بیان میں تمثیل ومجاز کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور غیر مشہور حقائق کو ممکن حد تک مشہود ومحسوس صورت میں پیش کیا گیا ہے تاکہ بندے اس عالم اور اس کی نعمتوں کو بقدرِ فہم واستعداد سمجھ سکیں اور ان کے دلوں میں ان کے حصول کی تمنا پیدا ہو اور وہ دنیا کے لذائذ میں کھو کر نہ رہ جائیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس دوسری دنیا کے اثبات میں قرآن نے جو عقلی دلائل دیے ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق فطرت کے حقائق اور مظاہر سے ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے کہ اس کائناتِ ماڈی کی ہر چیز ''زوجین'' یعنی جوڑوں کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ اس کلّیہ سے اس عالم کی کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر شے نہ صرف اپنے وجود کے لیے ''زوجین'' کی محتاج ہے بلکہ اس کا مقصدِ تخلیق بھی ان ہی پر منحصر ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ` فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِط اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ. (سورۂ ذاریات ۵۱:۴۹-۵۰)	''ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو، پس اللہ کی طرف تیز گامی کرو، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھول کر ڈرا دینے والا ہوں۔''

اس آیت میں 'زوجین' سے مراد ایسے جوڑے ہیں جو اپنی ساخت اور خواص کے لحاظ سے باہم اختلاف رکھتے ہیں، لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں کامل درجہ کا اتحاد وموافقت ہے، ایسا غیر معمولی اتحاد کہ اس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال خود مرد وعورت کا وجود ہے۔ یہ جوڑا اپنے تمام خلقی اور نفسیاتی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہے۔ زوجین کے اس اتحاد واختلاط کو قرآن میں وجود خدا کی ایک

بڑی نشانی کہا گیا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ. (سورۂ روم ۳۰:۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور غم گساری پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

جب اس کائنات کی ہر چیز کی تخلیق اصولِ زوجین پر ہوئی ہے تو پھر ماننا ہوگا کہ اس عالمِ مادّی کا بھی ایک زوج ہے اور وہ عالم آخرت ہے۔ اور یہی انسان کے سفرِ زندگی کی آخری منزل ہے۔ سورۂ ذاریات کی مذکورہ بالا آیات میں ''تذکرون'' اور ''ففروا الی اللّٰہ'' کے جملوں سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آخرت یعنی عالمِ غیر مادّی کا وجود انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کو مانے بغیر اس کے بہت سے مسائل کا کوئی حل ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں ظلم و زیادتی کے اندوہ ناک واقعات برابر پیش آتے رہتے ہیں اور موجودہ دور بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ قانون اور عدالت کے باوجود بسا اوقات مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو وہ مکمل سزا نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شخص سیکڑوں افراد کو ناحق قتل کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں اس جرم کی بڑی سے بڑی سزا اس کے سوا اور کیا ہوگی کہ اس قاتل کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن کیا اس سزا کو سیکڑوں لوگوں کے قتل کی سزا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو ایک مقتول کی سزا ہوئی، بقیہ مقتولین کی سزا اسے کہاں ملی۔ اس کے جرم کی مکمل سزا تو یہ ہوگی کہ اس کو سو مرتبہ قتل کیا جائے۔ اور یہ اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ یہ صورت حال خود مطالبہ کرتی ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہو جہاں مجرموں کو ان کے جرائم کی مکمل سزا دی جائے۔ اور اسی کا نام عالمِ آخرت ہے۔

قرآن مجید کے یہی پانچ بنیادی علوم ہیں جن کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا۔ ان ہی علوم پنجگانہ کو مختلف الفاظ و اسالیب میں قرآن کی مختلف سورتوں میں پیش کیا گیا ہے جو اعجاز بیان کا منتہائے کمال ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مصنف: رچرڈ ٹرناس

مترجم: نعیم احمد بلوچ

مغربی ذہن کی فکری تشکیل

''یہ کالم مشرق و مغرب کے علمی و فکری افکار کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ زیر نظر تحریر Richard Tarnas کی شہرہ آفاق کتاب The Passion of the Western Mind کا اردو ترجمہ ہے جو بالاقساط پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارے کا مصنفین کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کتاب میں دنیاے مغرب کے فکری ارتقا کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ قدیم یونانی دور سے لے کر موجودہ جدید دور کی دہلیز تک کی اس تاریخی داستان کو میرے پیش نظر ایک ہی جلد میں پیش کرنا مقصود تھا۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہی ہے کہ یہ ایک مربوط شکل میں اس طرح سے سامنے آئے کہ مغربی ذہن کا پورا ارتقا اور حقائق کے بارے میں ان کے بدلتے ہوئے تصورات سمیت سب کچھ بیان ہو جائے۔ دور جدید کے فلسفے، نفسیات، مذہب اور سائنس نے اس بے مثال ارتقا پر نئے پہلووں سے روشنی ڈالی ہے۔

اس بات کا خوب غلغلہ ہے کہ مغربی اقدار ٹوٹ رہی ہیں، آزاد نظام تعلیم زوال پذیر ہے اور ہماری تہذیبی جڑیں اس قدر مضبوط نہیں کہ وہ عہد حاضر کے پیچیدہ مسائل کا مسکت جواب دے سکیں۔ ہر آن بدلتی اس دنیا میں متذکرہ مسائل کے ردعمل میں کہیں عدم تحفظ کے احساس نے جنم لیا ہے تو کہیں ماضی کے مزاروں میں پناہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پس منظر میں پڑھے لکھے اور صحیح سمت میں سوچنے سمجھنے والے خواتین و حضرات میں بجا طور پر اس کتاب کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

دور جدید کی موجودہ ہیئت کیسے وجود پذیر ہوئی؟ جدید ذہن نے ان اصولوں کو کیسے دریافت کیا جن کی کارفرمائی

ہمیں آج ہر جگہ نظر آ رہی ہے اور ان کا استعمال آخر کس قاعدے ضابطے پر کیا گیا ہے؟ یہ ہیں وہ اہم سوالات جن کا درست جواب جاننے کے لیے ہمیں لازمی طور پر ان بنیادوں کا مطالعہ کرنا ہوگا جن پر آج کے دور جدید کی شان دار عمارت ایستادہ ہے۔ اس مطالعہ میں جہاں ہمیں قدیم افکار و اخلاق کا بے لاگ جائزہ لینا ہوگا، وہیں ہمیں اپنے دور کے ان اثرات کا کھوج لگانا ہوگا جو ماضی کا حصہ رہے ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ اس آگہی کے حصول کے لیے ہمیں اپنی دنیا کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ کرنا ہوگا اور اسی سے ہم اپنے آج کے پیچیدہ مسائل سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی راہ پا سکیں گے۔ مغرب کی تہذیبی اور فکری تاریخ تبھی ان چیلنجوں کا جواب دینے کے قابل ہو سکے گی جن کا آج ہمیں سامنا ہے۔

اس کتاب کے ذریعے سے میں نے اس تاریخ کے ضروری اجزاء کو عام قارئین کی دسترس میں لانے کی کوشش کی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے یقیناً اس کہانی کے وہی حصے بیان ہوئے ہیں جو میری نظر میں ضروری ہیں۔ مغربی ذہن کی تشکیل کی یہ داستان کسی رزمیہ ڈرامے کی طرح خوب صورت بھی ہی ہے اور تہ در تہ بھی۔ اس میں جن ادوار سے بطور خاص تعرض کیا گیا ہے، ان میں قدیم اور کلاسیکی یونانی دور، چوتھی تا پہلی صدی قبل از مسیح کا یونانی عہد، امپیرل روم، یہودی اور مسیحی ادوار، کیتھولک چرچ، وسطی دور، نشاۃ ثانیہ، دور عرفان و آگہی، آرٹ کا دور، رومانیت پسندی اور اس کے بعد ہمارا اپنا متاثر کن عہد شامل ہے۔

اگر ان شخصیات کی طرف آئیں جنھوں نے مغربی اذہان وقلوب کو بے حد متاثر کیا، مہتمم بالشان مسائل پر گفتگو کا ڈول ڈالا، حقائق تک رسائی میں مغربی ذہن کی رہنمائی کی کوشش کی تو ان میں تھالس (Thales) اور فیثا غورث سے لے کر افلاطون اور ارسطو تک، کلیمنٹ (Celement) اور بوتھیئس (Boethius) سے اکینس (Aquinas) اور آخم (Ockham) تک، اوڈکس (Eudoxus) اور طالمی سے کوپرنیکس (Copernicus) اور نیوٹن (Newton) تک، بیکن (Bacon) اور ڈیکارٹ (Descartes) سے کانٹ (Kant) اور ہیگل (Hegal) تک، اور پھر اس کے بعد کی اہم شخصیات بشمول ڈارون، آئن شٹائن (Einstein)، فرائڈ، اور اس کے بعد تک، سبھی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

نظریات وتصورات کی ان طویل اور عظیم معرکہ آرائیوں ہی کو مغربی روایت کہا جاتا ہے اور انھی کے نتائج واثرات ہم پر مرتسم ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک شخصی قسم کا یودھ بھی ہمارے پیش نظر رہا ہے۔ میری مراد سقراط سے ہے اور پھر معرکہ پال وآگسٹائن اور لوتھر بمقابلہ گلیلیو بھی۔ اس کے علاوہ کچھ نام قدرے کم مشہور بھی ہیں لیکن وہ اتنے

اہم ہیں کہ انھوں نے مغربی ذہن کے سفر کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی۔ یہ ایک عظیم المیہ داستان ہے اور اس المیے کی تہ میں کچھ حقائق بھی ہیں۔

آیندہ آنے والے صفحات میں جو داستان رقم کی جارہی ہے، اس میں ہمارے پیش نظر مغربی کلچر کے وہ نمایاں سنگِ میل ہیں جنھوں نے اس ارتقا میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے اور اس سلسلے میں ہماری توجہ کا محور فلسفہ، مذہب اور سائنس ہی رہا ہے۔

ورجینا ولف (Virginia Wolf) نے عظیم ادبی شہ پاروں کے متعلق جو کہا تھا شاید وہ اس عظیم عالمی جائزے پر بھی صادق آتا ہے:

"کسی ادبی شہ پارے کی کامیابی کا راز اس میں مضمر نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کے نقص سے پاک ہو۔ درحقیقت بڑے سے بڑے نقص کی موجودگی ہم کسی عظیم ترین شاہکار میں بھی برداشت کر سکتے ہیں لیکن اصل کمال تو یہ ہے کہ لکھنے والا ہمارے اذہان و قلوب کو اس طرح مسخر کر لے کہ ہمارا تصور اس باب میں آخری حد تک واضح اور غیر مبہم ہو۔"

میرے پیش نظر بھی یہی ہے کہ آیندہ صفحات میں جو کچھ بیان کروں وہ مغربی ذہن کے سفر کی ایسی آواز ہو جیسے ہر منزل اور ہر وادی اپنی داستان خود سنا رہی ہے۔

حقائق کے بیان میں، میں نے اپنی ذاتی یا موجودہ دور کی کسی رائے کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ جو بڑی عمیق، واضح اور دیکھی بھالی ہے۔ اس کے بالکل برعکس میں نے پوری کوشش کی ہے کہ حقائق جیسے ہیں، بلا کم و کاست ویسے ہی سامنے آئیں۔ میرا معاملہ بالکل ایسا ہی رہا ہے جیسا کسی شاہکار پینٹنگ کو سمجھنے اور مشاہدہ کرنے والے سچے ناظر کا ہوتا ہے کہ وہ اس کے اثرات کو اپنے ذہن پر پوری آزادی سے مرتسم ہونے دے اور پھر اس کے وہی معنی اور وہی اثرات لے جو اس تصویر کا اصل طرۂ امتیاز ہے۔

آج مغربی ذہن ایک عہد ساز تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یہ تبدیلی اس قدر وسیع اور متنوع ہے کہ اس کا موازنہ کسی بھی دور سے کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کا ہم اسی قدر شعور و احساس کر سکتے ہیں، جس قدر ہم اس کے بارے میں تاریخی طور پر آگاہ ہوں گے۔ ہر دور کو نئے سرے سے اپنے آپ کو دریافت کرتا ہوتا ہے۔ ہر نسل کو اپنے اس مخصوص نقطۂ نظر کا بار بار جائزہ لیتے رہنا چاہیے جس کے ذریعے سے وہ دنیا کو سمجھ رہے ہیں۔ اور اس عمل میں ہمیں بیسویں صدی کے آخری حصے کو بطور خاص اپنے سامنے رکھنا ہو گا جو ہمہ جہتی ہونے میں اپنا کوئی ثانی نہیں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رکھتا۔ یہ کتاب اسی کوشش کے تسلسل کی ایک کڑی ہے۔

باب اول۔۔۔یونانی فلسفے کا جائزہ

یونانی فلسفہ ایک پیچیدہ اور مائل بہ تغیر خصوصیات کا حامل ہے۔اس کے بنیادی امتیازات کو جاننے کے لیے ہم اس کی سب سے اہم خصوصیت کو زیر بحث لائیں گے۔ ہماری مراد ان کے ہاں دنیا کی تشریح مثل اولیٰ (Archetype Ideas) کے اصول پر کرنے کا مستقل اور ہمہ جہتی رجحان ہے۔

یونانی کلچر میں اس رجحان کا آغاز ہومر (Homer) کی رزمیہ شاعری سے ہوتا ہے اور اس کے بعد کے دور یعنی پانچویں صدی قبل از مسیح کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے درمیان تک اس کی چھاپ گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کا اولین اظہار اس وقت ہوتا ہے جب ایتھنز کے لوگ ایک دوسرے سے علمی مناظرے کرتے نظر آتے ہیں۔افلاطون کے مکالموں میں سقراط کے حوالے سے تو یہ رجحان کسی حد تک قاعدے کلیے میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دراصل یہ کائنات کی تشریح ہے جو قدیم ترین جوہر (Primordial essences) یا ماورائے مشاہدہ بنیادی اصولوں (Transcendent principes) کا منظّم بیان ہے جو کہیں امثال اور اعیان میں ڈھلا ہے تو کہیں آفاقی اور قائم بالذات تصورات میں اور کبھی یہ لافانی دیوتاؤں کی شکل اختیار کرتا ہے تو کہیں مقدس مبادیات اور مثل اولی کی صورت میں نظر آتا ہے۔اس منظرنامے میں نمایاں انحرافات بھی ہیں اور بعض جگہوں پر بہت اہم تضادات بھی۔ یہ رجحان سقراط، افلاطون اور ارسطو اور ان سے قبل فیثا غورث کے ہاں بھی پایا جاتا ہے اور اس کے بعد میں پلوٹینس کے ہاں بھی۔ لیکن ہومر اور ہیسڈ (Hesiod)، اشائی لس (Aeschylus) اور سوفکلس (Sophocles)، سب کے ہاں جو چیز ایک مشترکہ فکر کے طور پر نظر آتی ہے اور وہ یونانیوں کے اس مخصوص طرز فکر کی عکاسی کرتی ہے جس میں وہ زندگی کی گتھیوں کا ایک آفاقی اور ہمہ گیر حل چاہتے ہیں۔

اس وسیع تناظر میں جبکہ یہ بات بھی ہمارے ذہن میں ہے کہ یونانیوں کے ہاں قاعدوں کلیوں کو عام بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ہاں کائنات ظرف زماں سے بے نیاز متعدد جواہر کے ذریعے منظّم ہے جو حقائق تک پہنچنے میں مدومعاون ہیں اور ان کو متشکل بھی کرتے ہیں اور مفہوم بھی عطا کرتے ہیں۔

مثلِ اولیٰ کے ان تمثالات میں جو چیزیں شامل ہیں ان میں جیومیٹری اور حساب کی ریاضیاتی صورتیں، کائناتی اضداد جیسے روشنی اور تاریکی، تذکیرو تانیث، محبت اور نفرت، اکائی اور تعدد، انسان اور غیر انسانی مخلوقات، نیکی، جمال

،عدل اور دوسری اخلاقی اور جمالیاتی اقدار قابل ذکر ہیں۔قبل از فلسفہ یونانی ذہن میں یہ مثلِ اولیٰ اسطوری تجسیم اختیار کیے ہوئے ہیں۔ان میں ایرس (Eros) کیاس(Chaos) آسمان اور زمین(Ouranos and Gaia) شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض مکمل دیوی دیوتا کے روپ میں سامنے آتے ہیں جیسے زیوس(Zeus)، پرومیتھس (Prometheus) اور ایفروڈائٹ(Aphrodite)۔اس پس منظر میں کائنات کے ہر گوشے میں انھی مبادیات کا عمل دخل ہے۔

انفس وآفاق میں یہ مظہر یونانیوں کے ہاں یکساں طور جاری وساری نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے ممتاز قسم کے ناقابل تبدیل جواہر یا وجود ہمیں ملتے ہیں جو اپنی ذات میں ایک علیحدہ حقیقت کے مالک مانے جاتے ہیں۔اس بظاہر ناقابل تغیر خصوصیت اور آزادی کے بل پر افلاطون نے اپنے مابعدالطبیعیاتی افکار اور نظریہ علم کی بنیادیں استوار کی ہیں۔

مثلِ اولیٰ کی اس بحث نے ہمیں ایسے مفید سنگم پر پہنچا دیا ہے جہاں پر ہم ایک طرف ایک منزل کے اختتام پر اور دوسری طرف یونانی دنیا کے فلسفے کے ایک نئے باب کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور ہمارے سامنے افلاطون کی حیثیت ایک نمایاں نظریہ ساز اور وکیل کی ہے جس کی فکر نے تنہا مغرب کے فکری ارتقا کی اہم بنیادیں استوار کی ہیں۔ چنانچہ ہم افلاطون کے اصولِ تصور سازی پر گفتگو کا آغاز کر سکتے ہیں۔اس کے بعد کے ابواب میں ہم یونانی فکر کی تاریخ ساز ترقی کا مجموعی طور پر جائزہ لیں گے اور افلاطون کے معرکۃ آلاراء ہمہ جہتی مکالموں کا مطالعہ کریں گے اور ان نتائج فکر کی طرف بڑھیں گے جو یقیناً ان مکالموں ہی کی طرح ہمہ جہتی ہوں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

افلاطون کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات مدنظر رہے کہ اپنے فلسفے کا اظہار وہ ایسے پیرائے میں کرتا ہے جو خاصا غیر منظّم، غیر حتمی اور طنزیہ اسلوب لیے ہوتا ہے۔ہمیں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ افلاطون نے اپنی بات کے اظہار کے لیے جس ادبی اسلوب کا انتخاب کیا ہے وہ اپنے اندر ناگزیر طور پر صنعتِ ایہام کی خاصیت رکھتا ہے لیکن یہ اپنی جگہ درست بات ہے کہ افلاطون نے جان بوجھ کر بھی اپنے ہاں ایہام پیدا کرنے ہی کو اختیار کیا ہے۔ ہماری مراد مکالمے کے اسلوب سے ہے جو کہ ڈرامے میں اختیار کیا جاتا ہے۔

آخر میں ہم یقیناً اس امر کا بھی جائزہ لیں گے کہ اس کے فکر کا دائرہ کار کیا ہے، اس میں تغیر پذیری کی صلاحیت کتنی ہے اور پچاس برسوں پر محیط عرصے میں اس کے ہاں کس قدر فکری بلوغت ہوئی ہے۔اس تمام استعداد کو بہم پہنچانے ہی کے بعد ہم یہ مشروط قسم کی کوشش کر سکتے ہیں کہ بعض اہم تصورات اور اصولوں کو افلاطون کے حوالے سے

بیان کر سکیں۔ افلاطون کے فکر کی ترجمانی کی اس کوشش میں ہمارا اصل ماخذ خود افلاطونی روایت ہو گی۔ یہ روایت ایک مخصوص فلسفیانہ پس منظر میں وجود پذیر ہوئی ہے اور یہ خود افلاطون ہی کی ذات سے پھوٹی ہے۔ یونانی ذہن کے ان اہم ترین امتیازات کو متعین کر لینے کے بعد ہم افلاطون سے قبل سقراطی روایت اور اس کے بعد ارسطو کے دور کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

مثلِ اولیٰ کی تمثیلات

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فلاطونیت ایک بنیادی اصول کے گرد گھومتی ہے اور وہ ہے مثلِ اولیٰ کی صورت گری پر اصرار۔ عام طور پر حقیقت تک رسائی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس سے یہ اصرار تھوڑے مگر دقیق قسم کے گریز کا تقاضا کرتا ہے۔ اس گریز کا مفہوم جاننے کے لیے ہمیں پہلے اس سوال کا جواب چاہیے: افلاطونی مثلِ اولیٰ کی امثال یا صور کا ہماری روزانہ کی زندگی کے حقائق کے ساتھ آخر کیا تعلق ہے؟ اسی سوال کے جواب میں زیر بحث تصور کا ٹھیک فہم پوشیدہ ہے۔ افلاطون نے idea اور eidos کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال کیے ہیں۔ Idea کا لفظ انگریزی اور لاطینی سے لیا گیا ہے جبکہ eidos کا لاطینی ترجمہ forma ہے اور انگریزی میں اسے form کہیں گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

افلاطون کے فلسفے میں ان امثال کو قدیم ماننا ناگزیر ہے جبکہ ٹھوس اشیاء ان کی براہ راست مشتقات سمجھی جاتی ہیں۔ ان امثال کے بارے میں یہ خیال کرنا ہرگز درست نہیں ہو گا کہ یہ انسانی ذہن کے محض وہ غیر مادی تصورات ہیں جو کسی خاص چیز کی تعمیم کے بعد ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بجائے ان میں کسی بھی وجود کی ساری خصوصیات ہیں۔ ایک خاص معیار کی حقیقت پائی جاتی ہے جو اس مادی دنیا سے بہتر ہے۔ یہ افلاطونی امثال اس دنیا کی تشکیل بھی کرتی ہیں اور اس دنیا سے ماورا بھی ہیں۔ ان کا ظہور ظرف زماں کے اندر بھی ہے اور یہ وقت کے تنگنائے سے باہر بھی ہیں۔ یہ اشیاء کے جواہر کی پردہ داری کرتی ہیں۔

افلاطون اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ جب ہم اس دنیا کی کسی خاص چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس کا ایک ٹھوس حقیقت کے طور پر بہتر فہم اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب ہم اسے انتہائی ابتدائی شکل میں دیکھتے ہیں اور یہ مثلِ اولیٰ ہے جو ہمیں اس کی مخصوص ساخت اور کیفیت سے آگاہ کرتا ہے۔ ''خاص چیز'' سے مراد اس کا وہ جوہر خاص ہے جس کی خبر دینا اصل میں مقصود ہوتا ہے۔ کوئی چیز اس وقت ''خوبصورت'' قرار پائے گی جب اس میں حسن کا مثلِ اولیٰ پایا جائے گا۔ جب کوئی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ دراصل محبوب میں حسن (یا ایفروڈائٹ) دریافت کرتا ہے جس کا وہ

شکار ہو جاتا ہے گویا محبوب حسن کا آلہ یا اس کا ظرف بن جاتا ہے۔ اس واقعے میں اصل چیز مثلِ اولیٰ ہے (یعنی حسن ہے۔ مترجم) جس نے ہم پر زیر بحث واقعے کا فہم پوری گہرائی کے ساتھ واضح کیا۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ محبت کا تجربہ تو کسی کو اس طرح سے نہیں ہوتا۔ جب کسی کو کسی میں کشش محسوس ہوتی ہے تو وہ مثلِ اولیٰ میں نہیں بلکہ ایک خاص شخصیت میں ہوتی ہے، آرٹ کا کوئی نادر نمونہ یا خوب صورت منظر ہوتا ہے جو باعثِ کشش ہوتا ہے۔ حسن تو اس چیز کی صرف ایک صفت ہے، اس کا جوہر تو نہیں ہے۔ افلاطونی اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں: یہ صورت حال کا ادھورا مشاہدہ ہے۔ یہ درست ہے کہ عام آدمی کو مثلِ اولیٰ کا کوئی تصور نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہی ہے۔ ایک فلسفی جو حقائق سے پوری طرح آگاہ ہے، جب بہت ساری خوب صورت چیزیں دیکھتا ہے تو اس پر حسن مطلق کا راز ایک نظارے ہی میں کھل جاتا ہے کہ حسن اپنی ذات میں افضل ترین ہے، خالص ہے، ابدی ہے، یہ کسی خاص چیز یا شخص کی اضافی خصوصیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ایک فلسفی یہ سمجھتا ہے کہ یہ وہ خاص شکل یا صورت (مثلِ اولیٰ) ہی ہے جو حسن کے تمام نظاروں میں روبہ عمل ہے۔ وہ ظاہر کے پیچھے حسن کی اصل حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔ اگر کوئی چیز خوبصورت ہے تو اسی لیے ہے کہ یہ حسن کی مطلق صورت کا حصہ ہے۔

افلاطون کا مرشد سقراط نیک افعال کی مشترک اساس کا متلاشی تھا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ زندگی میں ایک انسان اپنے رویے کی جانچ پرکھ کیسے کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی جب تک کسی شخص کو کسی خاص صورت حال سے مجرد ہو کر یہ معلوم نہیں ہوگا کہ نیکی کیا ہے، اس وقت تک وہ نیک افعال کو کیوں کر اختیار کر سکے گا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ایک چیز دوسری سے بہتر ہے، ناگزیر ہے ایک مطلق خیر کا وجود مانا جائے اور پھر ان دو کا اس سے موازنہ کیا جائے، ورنہ لفظ ''اچھائی''، محض ایک لفظ ہے جس کی حقیقت میں کوئی ٹھوس اساس نہیں اور اس کے نتیجے میں انسانی اخلاقیات اپنی بنیاد ہی کھو دے گی۔ اسی طرح جب تک ہمارے پاس وہ ٹھوس اور فیصلہ کن معیار نہیں ہوگا جس کی بنیاد پر دو امور میں سے ایک کو مبنی بر عدل یا مبنی بر ظلم کا فیصلہ کیا جا سکے تو پھر ہر عمل انصاف کا حامل قرار پائے گا اور نیکی کا وجود اضافی اور غیر یقینی ہو جائے گا۔

سقراط کے مکالموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب اس کے مخاطبین عدل اور ظلم یا نیکی اور بدی کے مقبول تصورات پیش کرتے ہیں تو وہ انھیں متنبہ کرتے ہوئے محتاط تجزیے کا مشورہ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ نتائج فکر ناقص دلائل پر مبنی ہیں جو آخری درجے میں باہم متناقص و متضاد ہیں اور ان کی بنیاد کسی محکم چیز پر نہیں ہے۔ دراصل سقراط اور افلاطون کے مطابق نیکی کی زندگی بسر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ علم ہو کہ نیکی کیا ہے۔ اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مقصد درحقیقت انصاف اور سچائی کا آفاقی تصور اور اخلاقیات کا بنیادی جوہر ہے۔ یہ ضروری ہے کہ نیکی کے معنی ہر قسم کے حالات میں مستقل رہیں اور اس پر خارجی اور داخلی، سیاسی اور سماجی تغیرات کسی بھی طرح اثر انداز نہ ہوسکیں، ورنہ نیکی کا وجود خطرے میں رہے گا اور اس کی حیثیت محض اضافی ہوگی۔ سقراط کے حوالے سے اخلاقی اصطلاحات اور ان کی مستقل نوعیت کی تعریف بیان کرنے سے پہلے افلاطون نے نظریہ حقیقت کو بڑے واضح طریقے سے بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق اگر انسان اخلاقیات پر ایمان رکھتا ہے تو عدل اور اچھائی کے تصورات اس کے لیے لازمی ہیں تاکہ ان کی روشنی میں وہ زندگی بسر کر سکے۔ اسی طرح سائنسی نقطہ نظر کے قائل انسان کے لیے لازمی ہے کہ وہ دیگر ٹھوس تصورات سے واقف ہو تاکہ ان کی روشنی میں عالم کی تشریح کر سکے، دوسری عالمگیر حقیقتوں کا اسے علم ہو جن کی بنیاد پر وہ کیاس chaos (کائنات کی تشکیل سے پہلے مادے کا ہیولہ، جمود) اور تغیر میں تمیز کر سکے اور اشیاء کا باہمی ربط تلاش کر کے انھیں ایک وحدت دے کر ان کا ایک عاقلانہ شعور حاصل کر سکے۔ ایک فلسفی کا کام یہ ہے کہ وہ اخلاقی اور سائنسی، دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرے اور یہ تصورات ہی ہیں جو ان دو نقطہ نظر رکھنے والوں کو کسی نتیجے تک پہنچنے کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ بات افلاطون کے ہاں ایک طے شدہ امر ہے کہ جب متعدد چیزوں میں ایک مشترک خاصیت پائی جائے مثلاً تمام انسانوں میں ''انسانیت'' اور سفید پتھروں کی ''سفیدی'' ایک مشترک خصوصیت ہے، اس صورت میں اسے زمان ومکان سے ماورا کر کے کسی خاص شے تک محدود نہیں مانا جائے گا۔ یہ ایک غیر مادی، کئی پہلوؤں سے تجریدی اور زمان ومکان کی بندشوں سے پاک قرار پائے گی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جن چیزوں میں یہ خوبی پائی جائے وہ شے ختم ہو جائے لیکن اس سے اس کی وہ خصوصیت ختم نہیں ہوگی جو اس کی پہچان تھی۔ آفاقیت، عمومیت سے علیحدہ خاصیت رکھتی ہے کیونکہ یہ تغیر سے ناآشنا اور لازوال ہے، اسی لیے یہ کسی بھی حقیقت سے بڑھ کر حقیقی ہے۔

ایک دفعہ افلاطون کے ایک ناقد نے کہا: ''میں گھوڑے سے تو واقف ہوں، لیکن کیا گھوڑا پن بھی کوئی چیز ہے؟''

افلاطون نے جواب دیا: ''وجہ صرف یہ ہے کہ تمھارے پاس بینائی تو ہے لیکن بصیرت نہیں۔''

گھوڑے کا مثلِ اولیٰ ہی وہ بنیادی وصف ہے جو تمام گھوڑوں کی وجہ شناخت ہے اور افلاطون کے نزدیک یہ کسی بھی گھوڑے سے زیادہ مبنی بر حقیقت ہے کیونکہ گھوڑے کا مادی وجود تو محض ایک سانچہ ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو مثلِ اولیٰ کا تصور محض مادی خصائص تک محدود نہیں بلکہ اس مثال سے تو یہ روح کے اندر اترتی بصیرت معلوم ہوتی ہے جو فہم وشعور کے اندورنی دریچے وا کرتی نظر آتی ہے۔ اس مقام کر پہنچ کر ہم یہ ماننے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ مثلِ اولیٰ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ظاہری نہیں باطنی حقیقت کو واضح کرتی ہے۔

چنانچہ افلاطونی نقطہ نظر ایک فلسفی سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ عمومیت سے آفاقیت کی طرف جائے، چیزوں کے سطحی مطالعے سے اوپر اٹھ کر ان کے اندر اترے اور اس کے جوہر سے آگاہی حاصل کرے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لیاقت مستحسن ہی نہیں، بلکہ حقیقت تک رسائی کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ افلاطون فلسفی کی توجہ ظاہریت سے ہٹا کر اشیاء کے باطن کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے تاکہ حقائق سطحیت کے نقص سے پاک ہوں اور انسان کے اندر گیرائی اور گہرائی میں جا کر قوت مشاہدہ کی حس بیدار ہو۔ اسے اصرار ہے کسی چیز کا اگرچہ محض ایک پہلو سامنے ہوتا ہے، لیکن اصل میں اس کے اندر تمام اساسی جواہر کی آمیزش ہوتی ہے اور اس کی طرف رسائی صرف اسی وقت ممکن ہے جب ایک فعال ذہن کے ساتھ ساتھ اپنے وجدان کو بھی بیدار رکھا جائے۔

افلاطون کو ایسے علم پر کوئی اعتبار نہیں جو محض حواس کے ذریعے سے حاصل کیا گیا ہو کیونکہ ایسا علم ہمیشہ مائل بہ تغیر، اضافی اور ذاتی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہوا کا ایک جھونکا کسی شخص کے لیے خوش گوار ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے کے لیے ناخوش گوار۔ ایک مشروب ایک پینے والے کے لیے خوش ذائقہ ہو سکتا ہے اور وہی اسے بدمزہ قرار دیتا ہے جبکہ وہ بیمار ہو۔ چنانچہ حواس کے ذریعے سے حاصل ہونے والا علم مشاہدہ کرنے والے کی قوت اور صحتِ مشاہدہ پر منحصر ہوتا ہے، اس کی کوئی مستقل بنیاد نہیں ہوتی۔ موازنے کے ذریعے سے سچا علم تبھی حاصل ہوتا ہے جب تجریدی تصورات کو براہ راست سمجھا جائے کیونکہ یہ ابہام سے پاک اور ظاہریت کے سطحی پن سے ماورا ہوتے ہیں جبکہ حواس کے ذریعے سے حاصل کیا گیا علم محض ایک رائے، غلطی کا امکان لیے ہوئے اور مطلوبہ معیار سے عاری ہے۔ وہی علم غلطی سے پاک ہو سکتا اور علم کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جو ان تصورات کے ذریعے سے براہ راست حاصل کیا گیا ہو۔

مثال کے طور پر حواس سے سچائی نہیں دیکھی جا سکتی اور نہ ہی مطلق مساوات کا علم ہو سکتا ہے کیونکہ دنیا میں ایسی دو چیزیں پائی ہی نہیں جاتیں جو ہر ہر پہلو سے بالکل ایک سی ہوں۔ اب کامل مساوات اور برابری صرف تجریدی طور ہی پر اپنا وجود رکھتی اور صرف عقلی طور پر اس کا شعور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے مادی سطح پر جزوی طور پر ہم مساوات اور برابری کا کسی کو مصداق ٹھیرا سکتے ہیں۔ اسی طرح، افلاطون کے مطابق، دنیا میں کوئی چیز کامل دائرے کی شکل میں موجود نہیں، اسی لیے ہمیں دائرے کا کامل اور حقیقی تصور اس کے مثلِ اولیٰ ''دائرہ پن'' ہی سے اخذ کرنا پڑتا ہے۔ یہی معاملہ کامل نیکی اور کامل انصاف کا ہے۔ اسی لیے جب کوئی، کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے زیادہ خوب صورت اور زیادہ اچھا قرار دیتا ہے تو وہ زیرِ مشاہدہ چیزوں کا موازنہ اس ذہنی خوبصورتی اور ذہنی اچھائی سے کر رہا ہوتا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہے جو کامل اور مطلق ہوتی اور محض تصور میں موجود ہوتی ہے۔ اس دنیا کی کوئی بھی چیز کامل نہیں، وہ اضافی اور مستقل طور پر مائل بہ تغیر ہے جبکہ انسان کامل اور مطلق کی تلاش میں ہے اور اسے بجا طور پر اس کی ضرورت بھی ہے اور یہ لابدی چیز اسے صرف اور صرف تصور اور امثال ہی کی شکل میں مل سکتی ہے۔

(باقی)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

نکاح کیا نہیں ہے؟

دورِ جدید آزادی کا دور ہے۔ اس دور میں آزادی کی لہر مغرب سے اٹھی اور ہر نسل، رنگ اور تہذیب اور ان کی اقدار کو اپنی رو میں بہا کر لے گئی۔ اس بہاؤ کا شکار دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ عفت کی وہ قدر بھی ہوئی جو نکاح کی زنجیر سے مرد و عورت کو میاں بیوی کے مقدس اور پاکیزہ رشتے میں جوڑے رکھتی ہے۔

آج کی مغربی دنیا میں نکاح کوئی قانونی اور سماجی تقاضا نہیں ہے بلکہ اسے ثقافتی نوعیت کی ایک اضافی چیز سمجھا جاتا ہے۔ رہا مشرق تو اس میں نکاح کی زنجیر مغرب کی طرح ٹوٹی تو نہیں، مگر کمزور ضرور ہوگئی ہے۔ مسلم قوموں میں نکاح آج بھی ایک مطلوب شے ہے، لیکن میڈیا کی آزادروی اور نکاح کو مشکل بنادینے والے معاشی اور سماجی حالات کی بنا پر لوگ دوسرے راستے ڈھونڈنے لگے ہیں۔ اس عمل میں نکاح کے نام پر بعض ایسے تعلق وجود میں آرہے ہیں جو رسمی طور پر نکاح اور اپنی حقیقی شکل میں بدکاری ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان میں ان کا چلن عام نہیں لیکن عرب ممالک میں جہاں گرم آب و ہوا کے علاوہ دولت کی گرمی بھی عام ہے اور اس کے ساتھ مذہبی روایت کی پاسداری کا چلن بھی ابھی متروک نہیں ہوا، نکاح کی متعدد ایسی اقسام عام ہو رہی ہیں۔ ان میں دورانِ سفر کیا گیا نکاح، بیرونِ ملک قیام کے دوران میں کیا گیا نکاح، معاشرے کی نظر سے چھپ کر کیا گیا نکاح، کسی خاص مدت کے لیے کیا گیا نکاح وغیرہ شامل ہیں۔ بجاے اس کے کہ ہم فقہی انداز میں بحث کر کے نکاح کی ان اقسام میں پائی جانے والی غلطی بیان کریں، ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصل نکاح اپنی روح کے اعتبار سے کیا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں نکاح کے بارے میں یہ تصور رائج ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کر لیں تو یہ نکاح کا عمل ہے۔ یہ نکاح کا ایک فقہی تصور ہے۔ نکاح اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مرد اور ایک

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عورت کے مستقل اور علانیہ رفاقت کے اس عہد کا نام ہے جس کا اظہار وہ معاشرے میں اپنے جاننے والوں کے حلقے میں کرتے ہیں۔ یہاں مستقل تعلق کا مطلب دوامی تعلق نہیں۔ میاں بیوی جب چاہیں یہ رشتہ ختم کر دیں۔ مگر نکاح کرتے وقت اس تعلق کو کسی خاص مدت اور حالات کا پابند نہیں کیا جا سکتا بلکہ اسے مستقلاً ساتھ نبھانے کے عزم سے کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں میاں اور بیوی دونوں پر ایک دوسرے کے حوالے سے کچھ حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ یہ تعلق چونکہ علانیہ بھی ہوتا ہے اس لیے معاشرہ ان حقوق و فرائض کا ضامن ہوتا ہے اور ان دونوں میاں بیوی کو اپنے ایک بنیادی یونٹ یعنی خاندان اور اس تعلق سے پیدا ہونے والے بچوں کو ان کی اولاد کے طور پر بلاتردد قبول کر لیتا ہے۔

یہی نکاح ہے اور صرف یہی نکاح ہے۔ قرآن اسی کو پاکدامنی، عصمت اور عفت سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ قرآن کے اپنے بیانات کے مطابق صرف دو صورتوں میں ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ ایک "مسٰفحین" اور دوسرا "متخذی اخدان" ہونا (مائدہ 5:5)۔ پہلے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اصل مقصود صرف خواہشِ نفسانی کی امنڈتی موج کا نکاس ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک عارضی عمل ہے۔ اس کا مقصود میاں بیوی کے مستقل تعلق میں رہ کر اپنی حفاظت کرنا نہیں بلکہ جوانی کی مستی سے لطف اندوز ہونا ہے۔ ہم نے اردو میں بڑے محتاط انداز میں قرآن کے مدعا کو بیان کیا ہے ورنہ قرآن کے الفاظ تو بالکل واضح ہیں کہ یہ نکاس جذبات کا ایک عارضی عمل ہے، جس میں مستقل رفاقت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔

اس عمل کی سب سے عام شکل پیشہ ور عورتوں کے پاس جانا ہے۔ مگر نکاح کے نام پر کیے جانے والے وہ تمام معاہدات جن میں مستقل رفاقت پیشِ نظر نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص وقت یا حالات کی قید لگی ہوتی ہے اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان میں اصل خرابی یہ ہوتی ہے کہ مستقل رفاقت نہ ہونے کی بنا پر میاں بیوی کی حیثیت میں جو حقوق و فرائض خود بخود عائد ہو جاتے ہیں وہ ایسے تعلقات میں زیرِ بحث نہیں آتے۔ فریقین کی سیرت و عادات، اولاد اور اس کی تربیت، خاندان اور اس کی تشکیل ایسے تعلقات میں قابلِ ذکر چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ اصل مسئلہ وقتی جذبات کی تسکین ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایسے تعلقات کے جواز کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا۔

مسٰفحین کے بعد دوسری چیز متخذی اخدان ہونا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس میں مرد اور عورت کے بیچ میں تعلق تو کچھ مستقل نوعیت ہی کا ہوتا ہے، مگر یہ سب معاشرے کی نظر سے بچ کر چوری چھپے ہوتا ہے۔ یاری آشنائی کا یہ تعلق اعلانِ عام کے اس وصف سے محروم ہوتا ہے جو اس تعلق کو معاشرے کی طرف سے رشتے کی سندِ قبولیت عطا کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حقوق و فرائض پر کوئی توجہ دلانے والا رہتا ہے اور نہ خاندان کا وہ ادارہ وجود میں آتا ہے جو زمانے کے ہر سرد و گرم اور مزاجوں کے ہر اختلاف کے باوجود ممکنہ حد تک اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا تعلق مزاجوں کے معمولی اختلاف، خوف و پریشانی اور زندگی کے کسی معمولی سے مسئلے کی مار بھی نہیں سہ پاتا اور اپنے پیچھے بدنامی، ناجائز اور لاوارث بچوں اور بے وفائی کا داغ لیے منتشر جذبات اور شکست خوردہ نفسیات پر مبنی شخصیات چھوڑ جاتا ہے۔

نکاح کیا ہوتا ہے، یہ بات دنیا ہمیشہ سے جانتی تھی۔ نزولِ قرآن سے قبل بھی نکاح ہوتے تھے۔ نبوت سے قبل خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح ہوا۔ اس لیے قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ نکاح کیا ہوتا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے مسٰفحین اور متخذی اخدان کے الفاظ استعمال کر کے ہمیشہ کے لیے یہ بتا دیا کہ نکاح کیا نہیں ہوتا۔ اسی کی بنیاد پر زمانۂ جاہلیت میں رائج نکاح سے انحراف کی بعض صورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دیا تھا اور اسی کی روشنی میں آج ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ نکاح کے نام پر معاشرے میں جو کچھ سامنے آتا ہے وہ درست ہے یا نہیں اور جو غلط ہے وہ کس بنیاد پر غلط ہے؟

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خورشید احمد ندیم

میاں طفیل محمد کی یاد میں

''مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے دست راست اور جماعت اسلامی کے دوسرے امیر جناب میاں طفیل محمد صاحب ۳ جولائی ۲۰۰۹ کو قضاے الٰہی سے وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ زیر نظر تحریر میں جناب خورشید احمد صاحب ندیم نے میاں طفیل محمد صاحب کی شخصیت اور کردار کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔'' (ادارہ)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فکر بالعموم کسی صاحب علم کے نہاں خانۂ دل میں جنم لیتی، اس کی تنہایوں کو آباد کرتی اور مثل کتاب کسی علمی قالب میں ڈھل جاتی ہے۔ علم کا سفر اکثر اس منزل پر تمام ہو جاتا ہے۔ تاہم صاحبِ فکر کے ہاں یہ خواہش یقیناً موجود ہوتی ہے کہ اس کی فکر ایک عملی حقیقت کا روپ دھارے، ہر ذہن کے دروازے پر دستک دے، اس کو دست و بازو میسر آئیں، ایک زمانہ اس سے فیض اُٹھائے اور زندگی کی تلخیاں اس کے سامنے پانی ہو جائیں۔ انسانی معاشرے کی گتھیاں اس سے سلجھنے لگیں، مسائل کی گرہیں اس کے فسوں سے کھلنے لگیں اور اس کی فکر ابن آدم کے لیے ایک نئی دنیا کو جنم دے۔

یہ خواہش عام طور پر خواہش ہی رہتی ہے کہ ایک فکر کو عملی حقیقت میں ڈھلنے کے لیے جن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے، ان کے راستے میں خود صاحبِ فکر کی افتادِ طبع حائل ہو جاتی ہے۔ علم مزاجاً خلوت پسند ہے۔ ہجوم سے کتراتا اور جلوت سے گریز کرتا ہے۔ صاحبِ علم کی بزم تک اگر اس کے خیالات کے علاوہ کسی کی رسائی ہوتی ہے تو وہ چند نفوس سے زیادہ نہیں ہوتے جنھیں وہ ہم مزاج سمجھتا اور یہ خیال کرتا ہے کہ ان کی ذہنی سطح ایسی ہے کہ ان سے ہم کلام ہوا جا سکتا ہے۔ اسے کسی ایسے ہم دم کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی فکر کو حرزِ جاں بنا لے۔ اپنے وجود میں اس کی شہادت

بن جائے اور پھر جسم و جاں کی ساری توانائیاں اس فکر کو عملی حقیقت میں ڈھالنے کے لیے صرف کر ڈالے۔ وہ اس فکر کے لیے راتوں کو جاگے اور دن میں دیوانہ وار پھرے۔ ہر دروازے پر دستک دے۔ ہر رکاوٹ کو پاؤں کی ٹھوکر پر رکھے۔ عزیمت اس کا زادِ راہ ہو اور پھر وہ وقت آ جائے کہ دنیا اسے اپنے نام سے نہیں، فکر اور صاحب فکر کے حوالے سے جاننے لگے۔ یوں کہیے کہ ہر صاحب فکر کو ایک میاں طفیل محمد کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی بہت خوش قسمت رہے کہ انھیں میاں طفیل محمد میسر آئے۔

ہماری تاریخ میں کتنے لوگ ہو گزرے جنھوں نے ایک میاں طفیل محمد کی خواہش کی۔ شبلی، ابوالکلام، یہاں تک کہ اقبال۔ سب نے چاہا کہ کوئی ایسا رفیق میسر آئے جو ان کے خوابوں کی تعبیر کے لیے خود کو صرف کر ڈالے۔ کوئی فرد، کوئی جماعت، لیکن وہ سیّد مودودی کی طرح خوش بخت ثابت نہ ہو سکے۔ شبلی کے منصوبے کاغذوں تک محدود رہے۔ ابوالکلام نے جماعت تک بنا ڈالی لیکن اگر کوئی ان کی داستانِ حسرت سننا چاہے تو ان کا وہ نوحہ پڑھ لے جسے جامع مسجد دلی کے میناروں نے سنا اور رو دیے۔ علامہ اقبال تو زندگی کے آخری ایّام میں بھی ایک جماعت کا خواب دیکھتے رہے لیکن اس کی تعبیر کوئی نہ دے سکا۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا معاملہ ان سے مختلف رہا۔ ان کی علمی آراء، نتائج فکر، حکمتِ عملی، ہر پہلو سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور سچ یہ ہے کہ اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ کس کی حیثیت ہے کہ اس کی شخصیت کا ہر پہلو تنقید اور نقص سے پاک ہو، لیکن اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ سیّد مودودی کے افکار نے ایک زمانے پر اپنا اثر ڈالا۔ ان کی فکر کو کروڑوں لوگوں نے دین کی واحد تعبیر کے طور پر قبول کیا۔ ایک جماعت وجود میں آئی جس کے نظم کے تحت لاکھوں لوگوں نے اس فکر کے فروغ کو اپنا مقصدِ حیات بنایا۔ سیاست اور سماج کی وادیوں میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی۔ اس فکر نے ہمارے مذہبی ذہن پر اتنا اثر ڈالا کہ بظاہر اس سے اختلاف رکھنے والے آج ان کی اصطلاحوں میں کلام کرتے اور تفہیمِ مدعا کے لیے خود کو ان کی وضع کردہ تراکیب کا محتاج پاتے ہیں۔ یہ سب محض اتفاق سے نہیں ہوا۔ وہ لوگ تو شاید انگلیوں پر گنے جا سکیں جو مولانا مودودی سے کسی شخصی تعلق کا دعویٰ کر سکتے ہوں۔ وہ مزاجاً کبھی ''عوامی'' نہیں بن سکے۔ ان کی تحریر خواص کے لیے تھی اور تقریر بھی۔ عام آدمی کو ان تک رسائی نہیں تھی۔ اگر کوئی خوش قسمتی سے ان کے قریب پہنچ جاتا تو رسمی دعا سلام سے بات آگے بڑھ نہ پاتی۔ وہ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ اس مزاج کا آدمی اگر الطاف گوہر مرحوم کے الفاظ میں ''عزیزِ جہاں'' بنا تو اس کا سہرا یقیناً ان کے سر ہے جنھوں نے ان کے قرب سے فیض اُٹھایا، اسے اپنے وجود میں سمیٹا اور یوں عام آدمی اور مولانا

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

مودودی کے درمیان ایک پل بن گئے۔ایسے سب سے بڑے پل کا نام میاں طفیل محمد ہے۔

میاں طفیل محمد نے جب یہ شعوری فیصلہ کیا کہ وہ مولانا مودودی کی تحریک کا حصہ بنیں گے تو اس وقت وہ ایک نوجوان وکیل تھے۔نوجوانی میں ہر آدمی رومان پسند ہوتا ہے۔تاہم اس کا انحصار ایک فرد کی بلندیٔ پرواز پر ہے کہ اس کا رومان ایک نسوانی وجود کے نشیب وفراز میں الجھ کے رہ جاتا ہے یا وہ ایک مقصد کے تحت ایک زمانے کو بدلنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔میاں طفیل محمد کا رومان دوسری طرح کا تھا۔شادی کا رومان ابھی جوان تھا کہ جماعت اسلامی کے تاسیسی اجتماع میں جا پہنچے۔کوٹ پتلون اور نکٹائی کے ساتھ رکنیت کے لیے درخواست گزار ہوئے تو تقویٰ اور للّٰہیت کو ظاہری لبادے میں تلاش کرنے والے مزاحم ہوئے۔یہ حلیہ اور جماعت اسلامی کی رکنیت! قافلے کے حدی خواں نے سفارش کی اور چھ ماہ کے لیے آزمایشی بنیادوں پر درخواست قبول کر لی گئی۔آدمی اصلاً اپنے اندر چھپا ہوتا ہے۔جب وہاں یک سوئی اور اخلاص ہو تو ظاہر کے بدلنے کے لیے چھ ماہ بہت ہوتے ہیں۔وہ دن اور زندگی کا آخری دن،معترضین رخصت ہو گئے لیکن طفیل مجسم جماعت اسلامی ہو گئے۔واقعہ یہ ہے کہ جس جماعت اسلامی کو آج ہم تناور درخت کی طرح دیکھتے ہیں، یہ میاں طفیل محمد کے ایثار کا ایک مظہر ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جماعت اسلامی آج ایک منظّم جماعت اور ادارہ ہے۔اس کی اساس ایک فکر پر ہے اور یہی جماعت سے وابستگی کے لیے سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔سیّد منور حسن اس جماعت کے چوتھے امیر ہیں۔چاروں امراء کے مابین کوئی خونی تعلق ہے نہ علاقائی۔بانی امیر حیدر آباد دکن کے تھے تو دوسرے پنجاب سے۔تیسرے پٹھان تھے تو چوتھے ''مہاجر''۔ ان سب کا انتخاب ہوا۔جماعت اسلامی کے ارکان نے انھیں اپنے ووٹوں سے چُنا۔ووٹ دینے والے چاروں صوبوں کے تھے اور ہر رنگ ونسل کے۔لیکن ان کی تربیت اس نہج پر ہوئی کہ ایسا کوئی تعلق، رشتہ اور وابستگی ان کے نزدیک امارت کا پیمانہ نہیں تھی جنھیں سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے اور جن کی بنیاد پر ہمارے ہاں کم وبیش ہر سیاسی ومذہبی جماعت میں قیادت کا انتخاب ہوتا ہے۔''انتخاب'' کا لفظ شاید معاملے کی صحیح تعبیر نہ ہو، درحقیقت لوگ رنگ نسل اور وراثت کے اصول پر اپنی جماعتوں پر مسلط ہوتے اور اسے اپنا استحقاق سمجھتے ہیں۔جماعت اسلامی نے اگر اس کے برخلاف،عمومی روش سے ہٹتے ہوئے یہ جزیرہ آباد کیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک ادارے کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اس کا سہرا بلا مبالغہ میاں طفیل محمد کے سر ہے جنھوں نے مولانا مودودی کی زندگی میں بطور قیم اور پھر امیر جماعت کی حیثیت سے جماعت کو ادارہ بنانے میں اپنی ساری عمر کھپا دی۔

وہ محض ایک منتظم نہیں تھے، بلاشبہ ایک صاحبِ عزیمت شخصیت بھی تھے۔انھوں نے جماعت اسلامی کو ایک

شعوری اور قلبی تعلق کے ساتھ قبول کیا اور اس معاملے میں پوری طرح یکسو ہو گئے کہ رضاے الٰہی کے حصول کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو بس یہی ہے۔ اس شرح صدر کے بعد انھوں نے اس راہ میں پیش آنے والی ہر آزمایش کو ایک نعمت سمجھتے ہوئے، آگے بڑھ کر گلے لگایا۔ پھر دار ورسن ان کے لیے شاعرانہ تلمیحات نہیں تھیں، کتاب زندگی کے اوراق تھے۔ ایک مرتبہ جیل میں ان کی داڑھی مشقِ ستم بنی تو ایک دنیا کو بے چین کر گئی۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس وقت جماعت اسلامی کا حصہ نہیں تھے۔ گزرے دنوں کی یاد میں تلخی کا غلبہ تھا لیکن اس خبر نے انھیں مضطرب کر دیا۔ اپنے ایک پرانے اور مخلص ساتھی کی یہ توہین ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ کمرے میں مضطربانہ چکر لگاتے اور کہتے: ''میں جا کر اس داڑھی کو چومنا چاہتا ہوں جو اللہ کی راہ میں کھینچی گئی''۔ میاں طفیل محمد کے لیے یہ جذبات ایک ایسے آدمی کے تھے جو اس راہ میں ان کا ہم سفر نہیں تھا اور فکر کے حوالے سے بھی شاید بہت فاصلے پر کھڑا تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ جسے حق سمجھ رہے ہیں، اس کے لیے اتنے یکسو ہیں کہ اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اللہ کے حضور میں صحتِ فکر سے زیادہ اہم وابستگی فکر ہے۔ ہماری بصیرت محدود اور ہماری عقل دھوکا دے سکتی ہے۔ اللہ کو مطلوب یہ ہے کہ ہم جسے اس کا منشا سمجھتے ہیں، اس کے لیے کتنے مخلص اور کتنے ایثار کیش ہیں۔ میاں صاحب کی حنفیت ان کی شخصیت کا شاید سب سے دلکش اور قابل رشک پہلو ہے۔

سماجی تعلق میں بھی میاں طفیل محمد منفرد تھے۔ وہ جسے عزیز رکھتے دل سے عزیز رکھتے۔ کسی کے ساتھ فکری اختلاف کو وہ اس کے دائرے سے بڑھنے نہ دیتے۔ اس کے لیے دل میں روگ پالتے نہ اسے قطع رحمی کا سبب بناتے۔ ایک واقعے سے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ استادِ محترم جاوید احمد صاحب غامدی نے جب ازدواجی سفر کا آغاز کیا تو وہ جماعت اسلامی کے رکن نہیں تھے۔ جماعت سے ان کی رکنیت کوئی وجہ بتائے بغیر ختم کی جا چکی تھی۔ ہماری سماجی روایت ہے کہ نو بیاہتا جوڑے کو قریبی اعزہ واقربا اپنے ہاں کھانے پر مدعو کرتے ہیں۔ شادی کے بعد محترم جاوید صاحب جس پہلی دعوت میں شریک ہوئے، اس کے میزبان میاں طفیل محمد تھے۔

میاں طفیل محمد مرحوم نے فکرِ مودودی کو عام کرنے کے لیے جو کردار ادا کیا، اسے ایک اور زاویے سے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انسان اس دنیا میں محدود صلاحیتوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اس کے لیے آزمایش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے وجود کے اندر جھانکے اور دیکھے کہ اللہ نے اسے کیا صلاحیت ودیعت کی ہے۔ خود شناسی کے اس مرحلے سے گزرنے کے بعد اگر انسان اپنے کردار کا تعین کرے تو وہ سماج کی ترقی میں ایک مثبت اور قابلِ ذکر کردار ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح کسی فرد کے بارے میں کوئی راے دیتے وقت دوسروں کو بھی یہی دیکھنا چاہیے کہ وہ اصلاً کس میدان کا

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

آدمی تھا۔میاں طفیل محمد مرحوم کی عظمت کو بھی ہم تب ہی جان پائیں گے جب ہم اس کردار کو صحیح تناظر میں دیکھیں گے جو انھوں نے جماعت اسلامی کی تاریخ میں ادا کیا۔اگر ہم ان میں مولانا مودودی کا علمی جانشین تلاش کرنا چاہیں تو یہ نہ میاں صاحب کے ساتھ انصاف ہوگا نہ اپنے ساتھ۔مولانا داؤد غزنوی ایک مرتبہ مولانا مودودی سے ملنے تشریف لائے تو کہا کہ مولانا آپ بھی کوئی ابن قیم پیدا کرتے۔مولانا مسکرائے اور دوسرے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ابھی تو قیم پیدا کر رہا ہوں'' اس کمرے میں قیم جماعت، میاں طفیل محمد موجود تھے۔جو بات مولانا نے ازراہِ تفنن کہی، اس میں ایک سنجیدہ پیغام ہے۔میاں طفیل محمد ابن قیم نہیں، قیمِ جماعت اسلامی تھے۔اگر ہم اس فرق کو سمجھ لیں تو میاں صاحب کے تاریخی کردار کا بہتر تعین کر سکیں گے۔

ہر اجتماعیت اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب اس کا ہر حصہ اپنے کردار کا پوری طرح ادراک رکھتا ہو۔ہم میں کوئی پیغمبر نہیں، اس لیے پیغمبرانہ جامعیت کی تلاش ایک لا حاصل سفر ہے۔ہمارے سامنے واحد راستہ یہ ہے کہ ہم کسی فردِ واحد میں یہ خوبیاں تلاش کرنے کے بجاے اجتماعی بصیرت کو بروئے کار لائیں اور یوں افراد مل کر ایک دوسرے کی کمزوریوں کا تدارک کریں تاکہ ان کی اجتماعی خوبیاں وہ نتائج مرتب کر سکیں جو کسی ہمہ جہتی تبدیلی کے لیے ضروری ہیں۔جماعت اسلامی کی تاریخ اور میاں طفیل محمد کی زندگی اس بات کی تفہیم کے لیے ایک اچھی مثال ہو سکتی ہے۔جماعتِ اسلامی پر بالعموم جو تنقید کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جماعت میں مولانا مودودی کا کوئی جانشین پیدا نہ ہو سکا۔بطور امر واقعہ اس میں کوئی کلام نہیں لیکن اگر اس معاملے کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھیں تو اس میں ہمارے لیے ایک سبق ہے۔مولانا مودودی اگر ایک عالمِ دین تھے اور بلا شبہ تھے تو پھر ہمیں ان کا جانشین موچی دروازے یا لیاقت باغ کے جلوت کدے میں نہیں، ۵۔اے ذیلدار پارک کی کسی خلوت گاہ میں ملے گا۔ہم اگر علم کی تنہایاں آباد کرنے کے بجاے عامۃ الناس کے جلسہ ہاے عام برپا کریں اور پھر یہ چاہیں کہ یہاں سے کوئی مولانا مودودی برآمد ہو تو پھر ناکامی پر ہمیں ''جلسہ عام'' کو مطعون کرنے کے بجاے اپنی بصیرت کو الزام دینا چاہیے۔اس سے یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم کوئی ذوالفقار علی بھٹو دریافت کر پائیں، لیکن مولانا مودودی نہ اس طرح بنتے ہیں نہ ملتے ہیں۔امام ابوحنیفہ نے اہلِ علم کی ایک مجلس بنائی جہاں صبح و شام علمی مسائل کی گتھیاں سلجھائی جاتی تھیں۔اس عمل کے نتیجے میں قاضی ابو یوسف ،امام زفر اور امام محمد جیسے لوگ ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔یہ سوال اُٹھانا بے معنی ہوگا کہ مجلسِ ابوحنیفہ سے کوئی صلاح الدین ایوبی کیوں نہیں اُٹھا؟

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟ اگر ہمارے نزدیک اصل کام دین کی فکری تجدید اور احیا ہے تو یہ کام ایک

خاص طرح کی حکمت عملی کا متقاضی ہے۔ اگر ہم نیا سیاسی منظر ترتیب دینا چاہتے ہیں تو اس کی حکمتِ عملی بالکل دوسری ہوگی۔ اگر تزکیہ نفوس کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں کوئی خانقاہ آباد کرنا ہوگی۔ اگر ہم یہ سب کام کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ہر طرح کے لوگ چاہییں جو فطری طریقے سے نمایاں ہوں اور فطری اسلوب ہی میں اپنا کام کریں۔ ہم عالم کو سیاست دان بنانے کی کوشش کریں نہ سیاست دان کو مدرس اور مربی۔ ایسی کوشش ولایتِ فقیہ کے تحت ایران میں کی گئی۔ تیس سال کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ ایسی ہر کوشش کا انجام صرف پاپائیت ہے اور یہ ایک سیاسی نظام کی ناکامی ہے۔ انسان کا تہذیبی ارتقا یہ بتاتا ہے کہ کسی ہمہ جہتی تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ انسانوں کی اجتماعی بصیرت بروئے کار آئے۔ انسانی اجتماعیت کو صرف مولانا مودودی ہی نہیں، میاں طفیل محمد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی اگر آج اپنا وجود رکھتی اور ایک ادارے میں ڈھل چکی ہے تو اس کا ادراک میاں طفیل محمد کے کردار کو صحیح تناظر میں جانے بغیر نہیں ہوسکتا۔ شبلی کا ''ابن قیم'' بھون کی خانقاہ میں کھو گیا، ''قیم'' انھیں میسر نہ آسکا۔ اقبال اس کی آرزو کرتے رہے۔ جس حد تک واعظین کی ضرورت ہے، معاشرے میں اقبال دکھائی دیتے رہے۔ کسی نے ان کے فکر کے فروغ کو زندگی کا کام نہیں بنایا اور اب وہ لائبریریوں کی زینت ہے یا عجائب خانہ اقبال کی۔ سید مودودی خوش قسمت رہے کہ نھیں میاں طفیل محمد میسر آئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ترتیب
محمد بلال

متفرق سوالات

[''یہ ان سوالوں کے جوابات ہیں جو غامدی صاحب نے ''دنیا'' ٹیلیوژن کے پروگرام ''دین و دانش'' میں دیے ہیں۔ انھیں محمد بلال نے ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔'']

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسلام ہی کیوں؟

سوال: دنیا میں بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ کیا یہ سبھی مذاہب صحیح ہیں یا ان میں سے کوئی ایک مذہب اور اگر صحیح مذہب اسلام ہے تو وہ کیسے؟

جواب: اس سوال کو قرآن مجید نے سورۂ آل عمران میں موضوع بنایا ہے۔ اور اس میں مذہب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اللہ کے نزدیک کبھی دو دین نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیا علیہم السلام بھی آئے ہیں، ان سب کو ہم نے ایک ہی دین دیا تھا۔ اور وہ دین یہ تھا کہ تم خدا کے بندے بن کر رہو۔ اور اس دین کا نام اسلام ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ 'إِنَّ الدِّيْنَ عِندَ اللّٰهِ الإِسْلاَمُ' (آل عمران ۳:۱۹) (اللہ کے ہاں صحیح دین اسلام ہے)۔ اسلام کا مطلب ہے: اپنے آپ کو پروردگار کی رضا کے سپرد کر دینا۔ یہ بڑا ہی خوب صورت لفظ ہے جو اللہ نے اپنے دین کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس کی حقیقت کو قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں واضح کیا ہے۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ 'اَسْلِمْ'، آپ اپنے آپ کو اپنے پروردگار کے حوالے کر دیجیے۔ انھوں نے کہا کہ 'أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ' (البقرہ ۲:۱۳۱) میں نے اپنے آپ کو جہانوں کے پروردگار کے حوالے کر دیا۔ اس حوالگی اور سپردگی کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بات کا اقرار کہ میرا ایک پروردگار ہے، میں اس کا بندہ ہوں اور اس دنیا میں میری حیثیت کسی ایسی مخلوق کی نہیں

ہے کہ جو آپ سے آپ وجود پذیر ہوگئی ہے، بلکہ میرے خالق نے مجھے وجود بخشا ہے اور میں اپنے وجود، اپنی زندگی اور موت اور اپنے احوال و مقامات کے لیے بھی اس کے حضور ہی میں جواب دہ ہوں اور اس کی رضا کا مرہون منت ہوں۔ اس بنیادی حقیقت کو مان لینے کے بعد میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دوں، اپنی بندگی کا اعتراف کر لوں۔ قرآن مجید نے جب یہ کہا کہ: 'وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنسَ اِلَّا لِیَعْبُدُونِ' (الذاریات ۵۱:۵۶) تو اسی بنیادی حقیقت کو بیان کیا کہ جن اور انسان اسی لیے وجود پذیر ہوئے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے بن کر رہیں۔ یعنی علم اور عمل دونوں میں اس اعتراف کے ساتھ جئیں کہ ہم اس زمین کے اوپر کسی خالق کی مخلوق ہیں، کوئی ہمارا پروردگار ہے اور ہمیں دنیا میں اس کا بندہ بن کر رہنا ہے۔ خدا کا بندہ بن کر رہنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے، وہ دین کی تفصیلات ہیں۔

اسلام کا آغاز

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سوال: اسلام کے بارے میں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا آغاز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا ہے۔ جبکہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا کا دین اسلام ہی تھا۔ آپ کی بات کی دلیل کیا ہے؟ میرے علم تو ہے کہ قرآن میں ایک جگہ آیا ہے کہ ابراہیم ہی نے تمھارا نام مسلم رکھا۔ اس سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم سے اس نام کی ابتدا ہوئی، لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام سے اس نام کا آغاز ہوا۔

جواب: لوگ یہ بات قرآن مجید اور انبیا علیہم السلام سے ناواقفیت کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ اسلام کی ابتدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہوئی ہے۔ اسلام کی ابتدا سیدنا آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے۔ اور جس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ ابراہیم ہی نے تمھارا نام مسلم رکھا، تو اس آیت میں بنی اسماعیل مخاطب ہیں۔ بنی اسماعیل کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم نے اپنے لیے جو مشرکانہ مذہب ایجاد کر لیا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ تمھارے باپ نے جب تمھیں اس بات کی نصیحت کی کہ تم نے اللہ کا بندہ بن کر رہنا ہے تو یہی نام تمھارے لیے پسند کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پہلے ماننے والوں کا کوئی اور نام تھا۔

اس وقت دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں وہ سب کے سب اپنے آپ کو مختلف شخصیات، قبیلوں اور علاقوں سے نسبت دیتے ہیں۔ ان تمام نسبتوں سے بالاتر نسبت اسلام کی نسبت ہے، وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا نام

اسلام رکھا ہے۔ یہ کسی وطن یا رنگ تک محدود نہیں اور نہ ہی کسی خاص شخصیت سے اس کی وابستگی ہے۔ یہ تمام انبیا علیہم السلام کا دین ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دین کی بنا نہیں رکھی، اس کی تجدید کی ہے، اسے زندہ کیا ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اس دین میں جو خرابیاں اور بدعتیں پیدا کر دی گئی تھیں، وہ انحرافات دور کر کے بالکل صاف صورت میں دنیا کو دیا ہے۔ حضور کا اصل کارنامہ یہی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے قدیم علما رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو 'ملت حنیفی کا مجدد' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

ملت حنیفی

سوال: ملت حنیفی سے کیا مراد ہے؟

جواب: ملت حنیفی سے مراد ایسی ملت ہے جو پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے آپ کو لگا لے۔ یہ ملت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت سمجھی جاتی ہے۔

دین کے دو دور ہیں۔ ایک دور وہ ہے جس میں انفرادی طور پر شخصیات کا انتخاب کر کے ان کو نبوت دی گئی۔ دوسرا دور وہ ہے جس میں سیدنا ابراہیم کی پوری اولاد کو اس منصب کے لیے منتخب کر لیا گیا اور ان میں انبیا علیہم السلام بھیجے گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ چیز یعنی نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ابراہیم علیہ السلام کی پوری میراث کے طور پر رکھی گئی ہے۔ یعنی حضور نے آ کر سیدنا ابراہیم کے دین کو زندہ کیا، اس کو پاک صاف کیا، اس کو انحرافات سے نکالا اور وہ بالکل واضح شکل میں، دنیا کو دے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسلام کا امتیاز

سوال: کیا اسلام اپنی اصل میں خدا کی معرفت کا نام ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو یہ چیز تو باقی بہت سارے ادیان میں بھی پائی جاتی ہے، پھر اسلام کا امتیاز کیا ہے؟

جواب: اسلام اس لحاظ سے خدا کی معرفت ہے کہ وہ ہمارا خالق ہے اور ایک دن ہمیں اس کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اور یہ جواب دہی اچھے عمل کی بنیاد پر ہو گی۔ پورا message یہ ہے۔ اگر آپ چند لفظوں میں اسلام کی حقیقت بیان کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ جس وقت میں یہ تسلیم کر لیتا ہوں کہ میرا ایک خالق ہے، ایک دن مجھے اس خالق کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ اور یہ جواب دہی کسی اور بنیاد پر نہیں، علم و عمل کی اصلاح اور میری پاکیزگی کی بنیاد پر ہو

گی تو جیسے ہی میں یہ مانتا ہوں تو میں ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے آپ کو اپنے پروردگار کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اب میں اسلام میں ہوں یعنی ایک مسلمان کی حیثیت سے جی رہا ہوں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کی تفصیلات ہیں۔ اور تفصیلات کے معاملے میں قرآن نے بڑی صاف بات کہہ دی ہے کہ اس کی تفصیلات کے دو حصے ہیں۔ ایک کا تعلق ایمان اور اخلاق سے ہے۔ اور دوسرے کا تعلق قانون سے ہے۔ ایمان اور اخلاق کے معاملے میں نہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہاں کوئی اختلاف تھا، نہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے ہاں کوئی اختلاف تھا، نہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کوئی اختلاف ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایمان و اخلاق تمام تر یکساں رہے ہیں۔ لیکن شریعت یا قانون ایسی چیز ہے جس میں کچھ قانونی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ حصہ ایسا ہے جو حالات کے لحاظ سے تبدیل بھی ہوتا رہا ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بعض صورتوں میں مختلف بھی رہا ہے۔

مذہب اور فطرت

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سوال: جو لوگ مذہب کو نہیں مانتے، ان کے ہاں بھی اخلاق اور خیر و شر کے جاننے کا اصول پایا جاتا ہے۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: مذہب تو انسان کی فطرت میں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آسمان سے کوئی بات آئے گی اور وہ آپ کی شخصیت کے لیے اجنبی ہو گی۔ انسان کے اندر جو کچھ ہے، مذہب اسی کو ابھارتا ہے۔ اسی وجہ سے جب ہم دین کا تعارف کراتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ ہدایت ہے جو اس نے انسان کی فطرت کے اندر رکھی۔ پھر انبیا علیہم السلام نے اس کی تفصیل کر کے اور اسے متعین کر کے انسان کو دے دیا۔ اس کے سوا انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ یہاں اس بات پر البتہ ضرور تنبیہ حاصل کر لینی چاہیے کہ ادیان کا جو اختلاف ہمیں نظر آتا ہے، اس میں ایک دین وہ ہے، جو انبیا علیہم السلام کا دین ہے، وہ جس طریقے سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، اسی طرح سے پہلے نبیوں کو بھی دیا گیا تھا۔ اسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ 'شَرَعَ لَکُم مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوحاً وَالَّذِیْ أَوْحَیْنَا إِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖ إِبْرَاہِیْمَ وَمُوسَی وَعِیْسَی.' (الشوریٰ ۴۲: ۱۳) ہم نے آپ کو بالکل وہی دین دیا ہے جو دین اس سے پہلے ہم نے نوح علیہ السلام کو دیا تھا۔ اسی کی نصیحت ہم نے آپ کو کی ہے۔ یہی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا، یہی مسیح علیہ السلام کو دیا تھا اور سب کو یہ ہدایت کی تھی کہ 'أَنْ أَقِیْمُوا الدِّیْنَ' (حوالہ سابقہ) اس دین

کے اوپر قائم ہو جاؤ۔ اس کو پوری قوت کے ساتھ پکڑ لو۔ اس کو اپنی زندگی کا دستور اور اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنالو۔ 'وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ' (حوالہ سابقہ) اور اس میں کوئی تفرقہ پیدا نہ کرو۔ انبیا علیہم السلام کے اس دین کا تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کا انتخاب کر کے اپنی ہدایت ان کو دیتا ہے اور وہ یہ ہدایت انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس کے سارے مراحل کو قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت جبریل امین کے حوالے کرتے ہیں۔ جبریل امین یہ ہدایت لے کر انبیا علیہم السلام کے پاس آتے ہیں۔ پھر وہ انسانوں کو ملتی ہے۔

دوسرا دین وہ ہے جس کو ہم صوفیانہ مذہب کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس دین کی بنیاد یہ ہے کہ انسان خود ریاضتوں اور چلّوں سے گیان، دھیان حاصل کر سکتا ہے۔ جس کو بدھا کی تعلیمات میں نروان کہا جاتا ہے یعنی درمیان کے اس واسطے وسیلے اور ذریعے کے بجائے، انسان اپنی ریاضتوں سے خود خدا سے تعلق پیدا کر سکتا ہے اور اس کی ہدایت اور رہنمائی بھی حاصل کر سکتا ہے۔

ریاضتیں اور چلّے

سوال: ریاضتوں اور چلوں سے کیا مراد ہے؟

جواب: ریاضتیں علمی بھی ہیں، نفسی بھی ہیں اور عملی بھی ہیں۔ علمی ریاضتوں کا مطلب یہ ہے کہ ایک سائنس دان جن طریقوں سے چیزوں پر غور کرتا ہے، آپ اس طریقے سے غور کرتے ہیں۔ نفسی ریاضتوں کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے نفس کے اندر جو ایک دنیا پوشیدہ ہے، آپ اس سے رابطہ پیدا کر کے، اس نفس کے حقائق کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد آپ بہت سی عبادات کی صورت میں، چلوں کی صورت میں ایسی ریاضتیں کرتے ہیں جس میں ان کے نزدیک آپ کا مادی وجود تحلیل ہوتا چلا جاتا ہے اور آپ کا حقیقی وجود یعنی آپ کے اندر جو شخصیت ہے اس سے آپ کا ربط پیدا ہوتا ہے۔ اس سے پھر آپ کے لیے راستہ کھلتا ہے کہ آپ ذات خداوندی کی معرفت بھی حاصل کر سکیں۔ اگر آپ ان مذاہب کا جائزہ لیں تو یہ زیادہ تر وحدت الوجود کے فلسفے پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ درحقیقت خدا اس کائنات سے ماورا کوئی ہستی نہیں ہے، بلکہ خدا ہی کا ظہور ہے جو آپ کو کائنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ صوفیانہ مذاہب ہیں۔ ان مذاہب کی بھی ایک پوری تاریخ ہے۔ یہ بھی دنیا کے اندر اسی طریقے سے موجود ہیں اور بہت عالمگیر سطح پر ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ آج بھی موجود ہیں۔ ہمارے پاس اس کی جو بہت نمایاں مثال ہے، وہ اس وقت بدھ مت اور ہندو مت کی صورت میں موجود ہے۔ چونکہ ان کے اندر بھی خدا کا ذکر ہوتا ہے اور کچھ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مذہبی تعبیریں ہوتی ہیں، کچھ آسمان سے تعلق ہوتا ہے تو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ بھی ایک نوعیت کا وہی مذہب ہے جو انبیا لے کے آئے ہیں لیکن اصل میں یہ دو الگ الگ مذاہب ہیں۔

اسلام اور صوفیانہ مذاہب میں فرق

سوال: پیغمبروں کے مذہب اور صوفیانہ مذاہب میں ایک چیز مشترک ہے۔ اور وہ ہے نیکی اور بدی کا شعور، اللہ تعالیٰ کو ماننا اور اس کے ساتھ ایک نوعیت کا تعلق قائم کرنا۔ تو پھر فرق کہاں واقع ہوا ہے؟

جواب: دو بنیادی چیزوں میں فرق واقع ہو گیا ہے۔ ایک خدا کے تصور میں۔ الہامی مذاہب میں خدا کا جو تصور دیا گیا ہے، اس میں کائنات ایک الگ چیز ہے، ذات خداوندی اپنی ذات میں ایک الگ ہستی ہے۔ وہ اس سے بالکل ماورا ہے اور اس ہستی کا اس کائنات میں کچھ نہیں ہے۔ نہ یہ کائنات اس کی ذات سے ہے۔ نہ یہ کائنات اس کے ساتھ سوائے مخلوق ہونے کے کسی نوعیت کا کوئی تعلق رکھتی ہے۔ وہ ایک بالکل یکتا وجود ہے۔ یگانہ وجود ہے۔ قرآن نے اس کو بیان کیا ہے کہ 'قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ' (اخلاص ۱۱۲: ۱) ان سے کہو کہ اللہ یکتا ہے، یگانہ ہے۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کو اس کی ذات سے یا اس کی ذات کو اس سے قرار دیا جا سکے۔

انبیا علیہم السلام کے دین میں خدا کا تصور یہ ہے۔ دوسری جانب صوفیانہ مذاہب کا تصور یہ ہے کہ یہ جو کائنات آپ کو نظر آتی ہے، ہم جو ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ درحقیقت ذات خداوندی ہی کا ظہور ہے جو ہمیں اس صورت میں نظر آتا ہے۔ اس تصور کے تحت پھر وہ مراحل بیان کیے جاتے ہیں کہ کس طریقے سے مرتبۂ لاہوت سے ناسوت تک یہ سارے مراحل طے ہوتے ہیں اور اس کے بعد ان کے ہاں خدا کا ایک تصور قائم ہوتا ہے۔ اس میں جو اصل ہدف ہے وہ بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ ہدف یہ ہے کہ آپ کو اس بڑے منصب تک پہنچنا ہے، جس میں آپ اپنی اصل حقیقت کو دریافت کر لیں۔ اس میں پھر چلوں اور ریاضتوں کی ایک پوری کی پوری شریعت ہے، جو اس کے اندر موجود ہے۔ بدھ مت کے ہاں آپ کو یہ چیز نظر آئے گی، اسی طرح ویدانت میں آپ کو یہ چیز نظر آئے گی۔ ہندوؤں کے ہاں اس کا بہت زیادہ اثر آپ کو محسوس ہوگا۔ اس وجہ سے یہ الگ الگ مذہب ہیں۔

نبوت کا سلسلہ منقطع کیوں؟

سوال: پہلی قوموں میں جب دین میں انحرافات اور بدعتیں پیدا ہو جاتی تھیں تو انبیا علیہم السلام کو ان کی اصلاح

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے لیے مبعوث کیا جاتا تھا جبکہ اب یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اسلام محفوظ ہو گیا ہے اور مزید انبیا کی ضرورت باقی نہیں رہی؟

جواب: ہمارے ہاں جو علم تاریخ کے ماہرین ہیں، وہ دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک قبل از تاریخ کا زمانہ ہے۔ اور دوسرا مابعد از تاریخ کا۔ یعنی ایک دور وہ ہے جس کی بس کچھ معلومات ہمیں حاصل ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہم روشنی میں کھڑے ہیں۔ اور ایک وہ زمانہ ہے جو بالکل ایسا ہی ہے جیسے آج کے روز وشب گزر رہے ہیں۔ اس زمانے میں سب چیزیں روشنی میں ہیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مابعد از تاریخ کے زمانے کے عین سرے پر ہوئی ہیں۔ عین جب وہ روشن دور شروع ہو رہا ہے۔ پہلے دور میں جو قبل از تاریخ کا دور ہے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انسانوں کے سامنے اللہ کی ایک حجت واضح ہو جائے اور پھر اس کی تجدید کی ضرورت نہ پڑے۔ اس دور میں اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے اندر انبیا علیہم السلام بھیجے، پھر جب انسانیت ذرا تھوڑی روشنی میں آنے لگی تو سیدنا ابراہیم کی ذریت کو منتخب کر کے ایک علاقے کا انتخاب کیا گیا کہ اس علاقے میں دین کا ایک مرکز بنایا جائے۔ یہی وہ دور ہے، جس میں سیدنا ابراہیم علیہم السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور بیت المقدس کی تعمیر ہوئی یعنی ان کی نسل سے دو مراکز قائم کیے گئے تاکہ لوگوں کے سامنے دین کی حجت تمام ہو۔ اس پر پھر کوئی دو ہزار سال کے قریب گزرے۔ یہاں تک کہ انسان تاریخ کی روشنی میں آ گیا۔ جیسے ہی روشنی میں آیا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اب چونکہ انسان تاریخ کی روشنی میں آ گیا تھا تو بار بار انبیا بھیجنے کی زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گویا عالمی سطح پر اللہ تعالیٰ انبیا کے ذریعے سے جو حجت تمام کرنا چاہتے تھے، وہ ہو گئی۔ پیغام پہنچ گیا، دعوت آ گئی۔ قرآن کو محفوظ کرنا ممکن ہو گیا۔ ہر چیز تاریخ کی روشنی میں آ گئی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ ختم کیا۔

ختم نبوت اور تمدنی تغیر

سوال: تہذیب کا یہ سفر جس میں انسان مسلسل رواں ہے ابھی رکا نہیں ہے، انسان آگے بڑھ رہا ہے اور مسلسل تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں، اس وجہ سے نبوت کے سلسلے کے رک جانے کا پر یہ اعتراض تو برقرار رہے گا۔

جواب: ایک دور وہ تھا جس میں انسانی زندگی بنیادی طور پر قبائلی تمدن کے اندر تھی۔ سیر وشکار کے زمانے میں ایک تمدن وجود میں آیا تھا اور بعد میں زرعی معیشت سے ایک دوسرا تمدن وجود میں آیا تھا، اسی کے ساتھ کچھ گلہ بانی شامل ہو گئی تھی، انسان اپنے معاشی معاملات کو انجام دے رہا تھا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک تغیر آنا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شروع ہوا ہے۔عین تغیر کے سرے پر اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری شریعت دے دی۔ یہ شریعت اس طریقے سے دی گئی کہ اس کے اندر اب اس نوعیت کے تفصیلی احکام دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی جو قبائلی تمدن کی ضرورت تھے۔وہ بنیادی باتیں واضح کر دی گئیں جن کو ہر دور پر Apply کیا جا سکتا تھا۔اس کے نتیجے میں شریعت بہت مختصر بھی ہو گئی۔ آپ اگر بنی اسرائیل کو دی جانے والی شریعت کو دیکھیں تو وہ بہت تفصیلی ہے۔اس کے اندر بعض اوقات جزئیات تک قانون سازی کی گئی ہے۔لیکن جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شریعت دی گئی تو ہر معاملے میں بہت محدود ہدایات دے کے باقی تمام چیزوں کو انسان کے اپنے غور وفکر کے لیے چھوڑ دیا گیا۔اس کی خوبی یہی ہے۔چنانچہ اس میں کسی تغیر وتبدیلی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

شریعتوں میں فرق کی حکمت

سوال: مختلف قوموں میں جو شریعتوں میں فرق رہا ہے اس کی حکمت کیا تھی؟

جواب: شریعت کا تعلق چونکہ ان معاملات سے ہوتا ہے، جو انسانی تمدن کے ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں اور تمدن کی تبدیلی قوانین میں بھی تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ایک زمانہ تھا جب شکار پر انسان کا انحصار تھا۔پھر وہ زمانہ آیا کہ جس میں زرعی معیشت وجود میں آ گئی۔پھر صنعتی انقلاب کا زمانہ آیا۔اب ہم ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس سے اصل میں تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ایسی تبدیلیاں جو معاشرت، سیاست اور معیشت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ان تبدیلیوں کو پیش نظر رکھ کر کچھ قانون میں تغیرات کرنے پڑتے ہیں۔آج کے دور میں بھی ہمارے ہاں جب پارلیمنٹ بنتی ہے تو اس کا ایک بنیادی فریضہ یہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ قانون سازی کرے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی ضرورتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، ان کے لحاظ سے نئے نئے قوانین بننے چاہییں، نئے نئے ضابطے آنے چاہییں۔اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت اور قانون میں بھی ملحوظ رکھا ہے۔البتہ ایمان اور اخلاق اسی طرح سے قائم ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی ہو بھی نہیں سکتی۔سچائی ایک بنیادی قدر ہے، انصاف ایک بنیادی قدر ہے، آدمی کو کم نہیں تولنا، لوگوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولنا، بددیانتی نہیں کرنی، رشوت نہیں لینی، کسی کو نقصان نہیں پہنچانا۔یہ اصل میں وہ بنیادی باتیں ہیں کہ جو ہمیشہ سے انسان کی فطرت کا تقاضا رہی ہیں۔انبیا علیہم السلام بھی ان کی تجدید ہی کرتے ہیں، ان کی طرف توجہ دلاتے ہیں، انھی کی بنیاد پر وہ دس احکام وجود میں آئے جو تورات میں Ten Comandments کے نام سے درج ہیں۔اور ہمارے ہاں وہی احکام سورۂ بنی اسرائیل میں اسی طریقے سے

بیان ہوئے ہیں۔ یہ بنیادی اخلاقیات ہے۔ اسی طرح ایمانیات کے مسائل بھی ہمیشہ یکساں رہیں گے۔ یعنی اللہ کو ماننا ، اللہ کے فرشتوں کو ماننا، اس کی کتابوں کو ماننا، اس کے انبیا کو ماننا، ایک دن اس کے حضور میں جواب دہ ہونا، ان میں نہ تو فرق ہوسکتا ہے اور نہ ہوا ہے۔

عبادات کی تاریخ

سوال: کیا پچھلی قوموں کے ہاں عبادات میں بھی فرق تھا؟

جواب: عبادات تو ہمیشہ سے ایسے ہی رہی ہیں، جیسا کہ آج ہیں۔ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ نماز ہمیشہ سے ہر دین میں شامل تھی۔ اسی طرح پانچ نمازیں تمام انبیا علیہم السلام کو پڑھنے کے لیے کہا گیا۔ البتہ ان کے اندر جو اذکار تھے، قرآن کے نزول کے بعد تبدیل ہوگئے۔ یہ تبدیلی تو آنی ہی چاہیے، اس لیے کہ زبان بدل گئی، قرآن مجید نازل ہوگیا۔ اس سے پہلے لوگ زبور یا انجیل کی دعائیں پڑھتے تھے یا اور دعائیں پڑھتے تھے۔ ایک نماز کا وہ ڈھانچہ جس کو اعمال سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس میں رکوع و سجود ہے، قیام ہے، یہ بالکل ایسے ہی رہا ہے۔

روزے کے بارے میں خود قرآن نے اعلان کر دیا ہے کہ روزہ ایسے ہی تم پر فرض کیا گیا ہے جس طرح کہ پہلی امتوں پر فرض کیا گیا ہے۔

حج کے بارے میں معلوم ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اس کے مناسک یہی رہے ہیں۔ اس لیے عبادات میں کوئی اصولی تغیر نہیں آیا سوائے ان چیزوں کے جو قرآن کے نزول کے بعد تبدیل کرنی ضروری ہو گئیں۔

مختلف فرقوں کی وجہ

سوال: اسلام ایک جانب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن و سنت بالکل محفوظ ہیں، لیکن دوسری طرف ہمارے چالیس بیالیس فرقے ہیں۔ اور ہر فرقہ خود کو حق پر اور دوسرے فرقے کو گمراہ سمجھتا ہے۔ یہ اختلاف کیوں ہے؟

جواب: فرقے بننے کی بڑی وجہ ضد اور ہٹ دھرمی ہوتی ہے۔ اور یہ بات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے کہ ہم نے سب نبیوں کو ایک ہی دین دیا تھا، اور اس میں جو بنی اسرائیل اور اہل کتاب نے اختلاف کیا 'بَغۡیًاۢ بَیۡنَہُمۡ.' (البقرہ ۲:۲۱۳) آپس کے ضدم ضدا کی وجہ سے کیا۔ شریعت کے اندر بنیادی اختلافات کہیں بھی نہیں ہیں۔ البتہ چھوٹے چھوٹے Interpretation کے اختلافات ہیں۔ انسان جب تک انسان ہے اس میں علمی اختلاف ہوگا اور وہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن مجید کی تعبیر میں بھی ہو جائے گا۔اس سے کوئی قیامت نہیں آتی۔اختلافات زندگی کا ذریعہ بنتے ہیں۔اسی سے انسانی زندگی میں ایک تنوع، جدت اور ندرت رہتی ہے۔اختلاف کو ختم نہیں ہونا چاہیے۔اس کے اندر حسن ہے۔ان کے ذریعے سے آپ چیزوں کے اندر اترتے ہیں۔ایک ہی چیز کو دیکھنے کا ایک زاویۂ نظر اور دوسرا زاویۂ نظر آپ کو آگے بڑھنے میں، ترقی کرنے میں مدد دیتا ہے۔انسان کو اگر آپ بالکل ایسی چیز بنا دیں کہ جو ایک سانچے میں سے نکل کر تیار ہو رہی ہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ انسان کے سوچنے کے انداز، اس کی فکر کے انداز، اس کے ردعمل کے انداز، اس کی نفسی صلاحیتیں، اس کی عبقریت، اور اس کی ذہانت، یہ سب چیزیں اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ان کی وجہ سے تھوڑے بہت اختلافات ہوتے ہیں۔اس طرح کے اختلافات سائنس، طب سب علوم وفنون میں ہوتے ہیں۔فرقہ بندی میں اختلافات جو مخالفت میں ڈھل جاتے ہیں، جس سے لوگ ایک دوسرے سے ٹوٹنا شروع ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ ضدم ضدا کی وجہ سے ہوتے ہیں۔آپ کسی بھی فرقے کے دوسرے فرقے کے ساتھ اختلافات کا جائزہ لے لیں، ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ اس میں کچھ شخصیات کے ساتھ غیر معمولی عقیدت وجود میں آ جاتی ہے۔پھر اپنی اپنی بھیڑوں کو اپنے باڑے میں جمع کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔پھر اس میں بعض جگہوں کے اوپر تعلیم ناقص ہوتی ہے، اور جہالت در آتی ہے، یہ چیزیں ہیں جو لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑاتی بھڑاتی رہتی ہیں۔ ورنہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں ایک چیز کو ایک زاویے سے دیکھ رہا ہوں اور آپ دوسرے زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔دوسروں کو جہنمی قرار دینا، ان پر فتوے لگانا، مسلمانوں کی امت کو پھاڑنا، زبان سے یہ کہنا ہے کہ ہم ڈیڑھ ارب کے قریب ہیں، لیکن اپنے گروہ کے سوا کسی کو مسلمان نہیں ماننا اور پھر قتل قتال تک نوبت پہنچا دینا، یہ سب چیزیں جہالت سے پیدا ہوتی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مسلمان اور اسلام

سوال: کسی بھی مذہب یا عقیدے کا اصل تعارف عموماً اس کے ماننے والے ہوتے ہیں، لیکن آج پاکستان سمیت عالم اسلام جس کردار کا مظاہرہ کر رہا ہے، وہ سب کے سامنے ہے، اس پس منظر میں آپ اسلام کو دوسروں کے سامنے کس طرح ایک بہترین مذہب کے طور پر پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: یہ خود انسان کی غلطیوں میں سے ہے۔کسی بھی چیز کو اس زاویے سے نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس کے ماننے والے نے کیا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ دین ایک دعوت ہے۔ میں جب آپ کو یہ نصیحت کروں گا کہ آپ کو کم نہیں تولنا چاہیے، جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تو کیا یہ نصیحت میرے ماننے یا نا ماننے پر منحصر ہے؟ یہ تو اپنی جگہ ایک حق ہے۔ ہر

شخص کواس کے سامنے سرتسلیم خم کرنا چاہیے۔اب اگر اسلام کو ماننے والے اس کی تعلیمات سے انحراف کرتے ہیں تو کیا ہوا۔اصل میں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ تعلیمات کیا ہیں۔وہ کیا بات ہے جو کہی گئی ہے۔اور اس کی دعوت لوگوں تک پہنچنی چاہیے۔یہ بالکل ایک دوسری بات ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنے اخلاق، اپنے کردار، اور اپنی سیرت پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے۔دیکھنا چاہیے کہ ہم اخلاقی لحاظ سے اتنی پستی میں کیوں اتر گئے ہیں۔ہمیں اپنی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے۔لیکن دنیا کے اندر دین کی دعوت افراد کے حوالے سے نہیں جانی چاہیے۔وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جانی چاہیے۔اسلام کو انبیا علیہم السلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار سے سمجھنا چاہیے۔اس کو لوگوں سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ انحرافات تو ہر دین میں ہو جاتے ہیں۔مثال کے طور پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے خالص توحید پر دنیا کو قائم کیا۔توحید کے حق میں انقلاب برپا کر دیا۔شرک کا خاتمہ کر دیا، علمی سطح پر شرک کو شکست دے دی، لیکن اس کے باوجود کون سا شرک ہے جو مسلمانوں کے اندر نہیں پایا جاتا۔اس ساری صورت حال کا ہر آدمی کو ادراک کرنا چاہیے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دین کے معلم

سوال: دین تو مکمل ہو چکا، لیکن کیا اس کو Explain کرنے کے لیے ولیوں، درویشوں اور صوفیوں کا ہونا ضروری ہے؟ کیا ہم ان کے بغیر دین کو نہیں سمجھ سکتے؟

جواب: اس چیز کی ضرورت صرف دین ہی میں نہیں بلکہ ہر علم میں ہوتی ہے۔یعنی کچھ لوگ کسی خاص علم کو اپنی زندگی کا اصل موضوع بنا لیتے ہیں۔مثال کے طور انسانوں کے لیے طب روزمرہ کی ضرورت ہے۔ہر انسان کو بیماری لاحق ہوتی ہے، اس نے اپنا علاج کرنا ہوتا ہے، لیکن ایسا تو نہیں ہوتا کہ سب لوگ طبیب یا ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔کچھ لوگ اپنے آپ کو اس پیشے کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے خاص کر لیتے ہیں۔اس کی تعلیم پاتے ہیں، اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔پھر اس کے بعد وہ ہمارا علاج معالجہ کرتے ہیں۔یہ چیز دنیا کے ہر علم میں ہوگی۔جس طرح باقی علوم کے ماہرین پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح مذہبی علوم کے ماہرین بھی پیدا ہوں گے۔اور ان ماہرین کی طرف رجوع بھی کیا جائے گا اور ان کی رہنمائی میں چیزیں سمجھی جائیں گی۔

اسلام ایک مستند دین

سوال: دین کا علم اسلام کی صورت میں Authentic کیسے ہے؟

جواب: یہ اس وجہ سے مستند ہے کہ قرآن مجید بالکل محفوظ ہے۔ دنیا کے اندر جو چیزیں تاریخی طور پر منتقل ہوتی ہیں، وہ دو ہی طریقوں سے ہوتی ہیں۔ یا وہ لوگوں کے اتفاق رائے سے منتقل ہوتی ہیں۔ اس کو اجماع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ تاریخی علم کی اصطلاح ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ دوسری چیز اخبار آحاد ہیں۔ یعنی ایک، دو، یا تین آدمیوں نے کوئی بات بیان کر دی۔ یہ بات کہ علامہ اقبال ایک قومی شاعر تھے، انھوں نے بانگ درا لکھی، بال جبریل لکھی۔ یہ بالا جماع ہر آدمی کو معلوم ہے۔ اسے ہم کہیں گے کہ یہ خبر ہمیں اجماع سے منتقل ہوئی ہے۔ اور یہ بات کہ علامہ اقبال نے فلاں وقت اپنے ایک ملاقاتی سے کی تھی، یہ بعض اوقات ایک ملاقاتی، دو ملاقاتی بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کو اخبار آحاد کہتے ہیں۔ یہ جو اس وقت ہمارا دین ہے، جس کو ہم اسلام کہتے ہیں، اس میں قرآن بھی اجماع سے منتقل ہوا ہے، سنت بھی اجماع سے منتقل ہوئی ہے۔ یعنی ایک لاکھ سے زیادہ لوگ تھے جو آپ پر ایمان لائے۔ آپ کے ذریعے سے ایک بڑی سلطنت قائم ہوئی اور پھر وہ تاریخ کی روشنی میں قائم ہوئی۔ پھر اس کا ایک نظم قائم ہوا۔ اور ایک نسل عمل کر رہی ہے اور دوسری نسل کو منتقل کر رہی ہے۔ یہ چیز ہے جس نے اس کو دنیا کی آخری درجے کی مستند چیز بنا دیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، یہ کوئی مذہبی معاملہ نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org